بنواس
شکیل اعظمی

شکیل اعظمی بظاہر اپنی عمر سے کم دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی تخلیقی زندگی کا قصہ مختصر نہیں ہے۔ وہ ادب اور فلم دونوں کے مزاج شناس ہیں۔ ان کی انفرادیت کا جو رنگ مجھے سب سے زیادہ پسند آیا وہ فطرت، مظاہر، مادی دنیا اور اپنی اجتماعی تاریخ سے ان کا شغف ہے۔ ان ترجیحات اور رویوں کا عکس ان کی حالیہ نظموں میں صاف نظر آتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں میں یہ کوشش قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

پروفیسر شمیم حنفی

9/جولائی 2020ء شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

جنگل ہمارا آبائی وطن ہے۔ ہزاروں برس پہلے جب زمین پر انسانی خون اور بارود کی لکیریں نہیں کھینچی گئی تھیں۔ جب نہ ملک تھے نہ شہر تھے، نہ ریاستیں تھیں، تب صرف زمین تھی، جنگل تھے اور ہم تھے۔ جنگل ہماری رگوں میں خون کے ساتھ بہہ رہے ہیں۔ وہ ہمیں پکارتے ہیں، اپنی تخریب کی فریاد کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ آواز ان سنی کر دیتے ہیں۔ شکیل اعظمی نے یہ آواز سنی ہے اور اپنے لفظوں میں اس آواز کی تصویر بھی بنائی ہے۔ اور تصویر کو گفتگو کا ہنر بھی عطا کیا ہے۔

جاوید اختر

31/مئی 2020ء، (ممبئی)

'بنواس' اپنی نوعیت اور مخصوص مضامین کے باعث ایک منفرد کتاب ہے جس کو کسی دوسرے تو کیا خود شکیل اعظمی کے سابقہ کلام کے ساتھ بھی رکھ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہندو مائی تھالوجی میں 'جنگل' کی تلمیح اور استعارے کو جو غیر معمولی اہمیت اور فضیلت حاصل ہے شکیل اعظمی نے اس کا انتہائی خوبصورت اور کامیاب احاطہ کر کے یقیناً اردو ادب میں اپنے لئے ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت آپ زمان اور مکان کی جن نئی جہتوں سے آشنا ہوتے ہیں وہ خیال افروز بھی ہیں اور خیال انگیز بھی۔

امجد اسلام امجد

30/جون 2020ء، (لاہور)

شکیل اعظمی کا 'بنواس' انسان اور پراکرتی کے عشق کا ایک ایسا کاویہ گرنتھ ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کی تہذیبی خاموشی نے شاعری کا روپ دھارن کرلیا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ کے جغرافیے میں اتنی زرخیز شعری زمین اور اتنا ہرا بھرا تخلیقی جنگل پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ برسوں پہلے میں نے شکیل کو اس غزل کی داد دی تھی جو 'بنواس' کی تکمیل کا آغاز تھی۔

ڈاکٹر راحت اندوری

12/مئی 2020ء، (اندور)
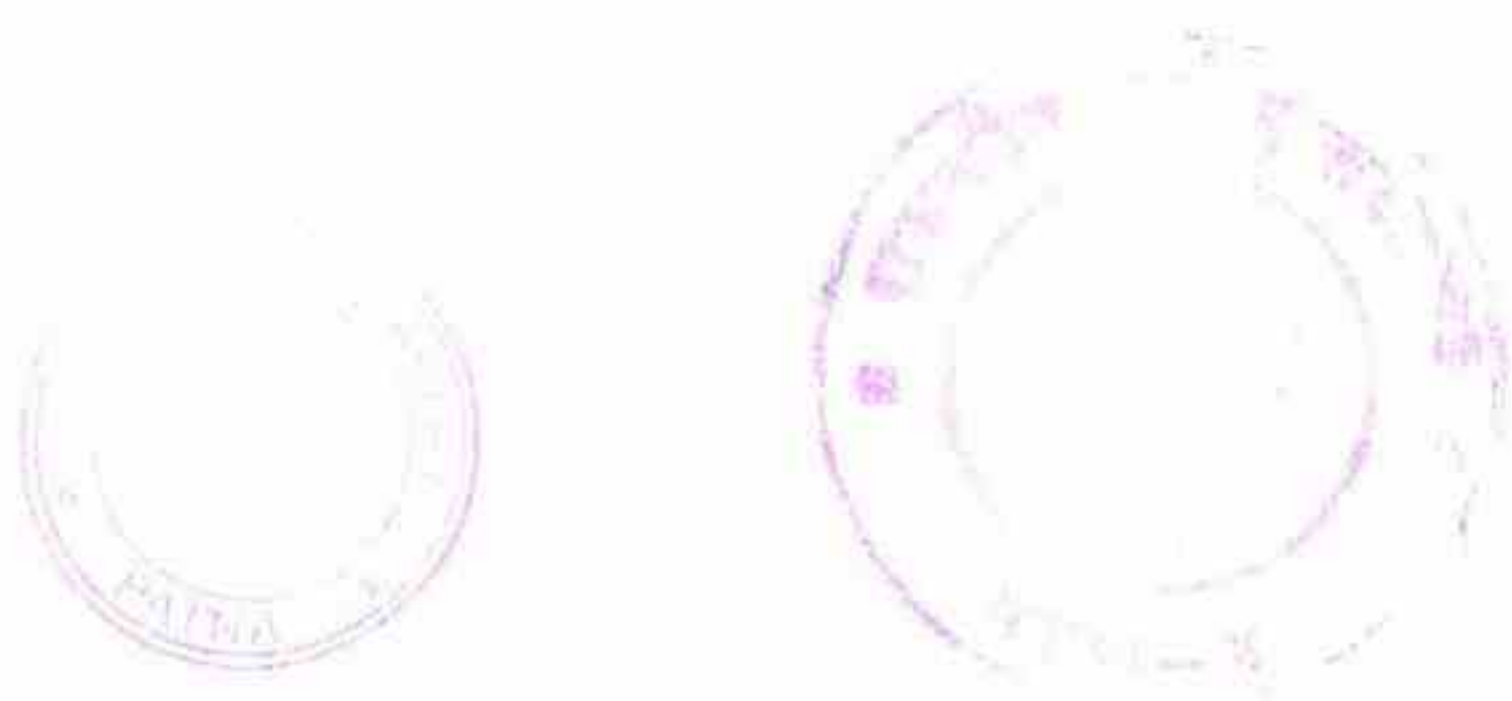
بنواس

شکیل اعظمی

ہزاروں سال تک سناٹے کو سنتا رہا چپ چاپ
میں اس کے بعد کتنے داستاں جنگل سے نکلا تھا

شکیل اعظمی

بنواس

شکیل اعظمی

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

نام کتاب : بنواس
شاعر و ناشر : شکیل اعظمی
سرورق : شاہد علیگ (گولڈ میڈلسٹ)
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
زیر اہتمام : مجلس فخرِ بحرین، برائے فروغِ اردو، بحرین

Banwaas
Poetry by Shakeel Azmi

A-201, Malwani Ramkrishna, Plot No. 52,
Mhada Complex, Malwani, Malad (West)
MUMBAI - 400095 (INDIA)
Email : shakeelazmi3@gmail.com
Mob.: 9820277932

Ist Edition : 2020 ₹ 350/-

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6	011-23260668
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی	011-23276526
رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد	+91 7905454042
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	+91 9358251117
بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4	+91 9304888739
کتاب دار، ممبئی	+91 9869321477
ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد	+91 9246271637
مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد	+91 9325203227
عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ	+91 9433050634
قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر	+91 9797352280
امرین بک ایجنسی، احمد آباد، گجرات	+91 8401010786

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +919971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

Composed at: Frontech Graphics 9818303136

اپنے دادا اصمد خان اور پردادا بھیکو خان کے نام

میرا سب کچھ مرے ماضی کے حوالے سے ہے
میرے منگل کو مرے بیر سے پہچانا جائے

❖

مہاپنڈت راہل سانکرتیاین اور ایودھیا سنگھ اپادھیائے ہری اودھ کی یاد میں

ادب، سماج اور مٹی کے حوالے سے

شکریہ تیرا خاک اعظم گڑھ
ہم یہیں کھیل کر بڑے ہوئے ہیں

جنگل سے انسان کا رشتہ تبھی سے ہے جب اُس نے کرہ ارض پر پہلا قدم رکھا تھا۔ یہاں کی پراسرار اور طلسمی زندگی ہمیشہ سے انسان کی فطرت پسند طبیعت کے لیے کشش کا باعث رہی ہے۔ 'بنواس' شکیل اعظمی کی تازہ ترین شعری تصنیف ہے جس میں جنگل اور انسان کے لازوال تعلق کو مختلف استعارات، تلمیحات، مذہبی روایات اور دیومالائی حکایات کی مدد سے اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ تعلق قدیم تر ہوتے ہوئے بھی جدید تر لگنے لگتا ہے۔ 'بنواس' کی شاعری ایک ایسا تخلیقی بیانیہ ہے جو حیرت انگیز ہے، معنی خیز ہے اور نئے شعری منظرنامے کے لیے بہت دلکش اور دلآویز ہے۔

مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو نے سن 2012 سے اب تک عالمی مشاعروں اور سیمینارز کے علاوہ اردو کے بہترین ادب کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کی ہے۔ شکیل اعظمی کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل کتاب 'بنواس' اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے جس کی اشاعت کا اہتمام مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو کر رہی ہے۔

ہم مجلس کی جانب سے 'بنواس' کی مقبولیت اور پذیرائی کے لیے نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔

شکیل احمد صبرحدی

بانی و سرپرست

مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو

فہرست

نظمیں

غزلیں

شکیل اعظمی: جنگل کا تخلیقی رزمیہ نگار

مظاہر فطرت کے تغیرات، بوقلمونی، یکسانیت اور انسلاکات نیز انسان کی ہر آن متغیر نفسی کیفیت، موانست اور باہمی یگانگت کے خوشگوار احساسات، تضادات اور غیر متوقع جہات کو ایک مرتعش تنظیمی استعارہ کے حوالے سے مختلف اصناف شاعری مثلاً غزل، پابند نظم اور نظم معری میں برتنا تخلیقی تازہ کاری اور پیرایۂ اظہار پر غیر معمولی قدرت کی مسکت دلیل ہے مگر اردو شاعری میں اس نوع کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ ایک مرکزی موضوع کی ممکنہ جہتوں سے معنی آفرینی اور فنی ہنرمندی کے خطوط پر استوار ایک کثیر الحسی شعری کائنات تشکیل کرنے کا کارنامہ عہد حاضر کے معروف شاعر شکیل اعظمی نے انجام دیا ہے۔ انہوں نے کائناتی تعینات کے ہر امکان سے بہرہ ور مظہر فطرت 'جنگل' کو ایک ایسے متحرک ہشت پہلو پیکر کے طور پر پیش کیا ہے جس کی ہر جنبش سے انکشاف اور حجاب کا ایک نیا در وا ہوتا ہے۔

زمانہ قدیم سے مذاہب، اساطیر، ثقافت، معاشرہ اور انسان کی مختلف سرگرمیوں کا مرکزی موتیف جنگل رہا ہے جسے آزادی، تخلیقی وفور، کائنات سے ہم آہنگی، زرخیزی، خود احتسابی، خوف، ہولناکی اور پراسرار دہشت کے داعیوں کو متحرک کرنے کا بنیادی وسیلہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ دیگر نوامیس فطرت کے مقابلے میں انسان اور جنگل کا رشتہ ہمہ گیر، پرپیچ اور بھید بھرا رہا ہے۔ گئے زمانوں میں جب مذہب ایک منظم ادارہ (Institution) کے طور پر قائم نہیں ہوا تھا تو گھنے جنگلوں کو خدا شناسی کی راہ میں حائل سمجھا جاتا تھا اور

انسان درختوں کو کاٹ کر کھلے آسمان پر آیت خداوندی کو دیکھ کر ان پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے جنگل کاٹنا ایک مذہبی فریضہ تھا۔ یوں بھی تھا کہ لمبے اور گھنے درخت انسان کو دھوپ کی تمازت اور تیز بارش سے پناہ دیتے تھے اور پھل دار درخت اس کی غذائی ضرورتوں کی تکمیل کرتے تھے۔ جنگل کا سناٹا خود احتسابی اور معرفت خداوندی کی راہ ہموار کرتا تھا۔ چھتنار درخت احساسِ تحفظ فراہم کر کے یہ باور کراتے تھے کہ مشکلوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور استقلال پر کاربند ہو کر کارزارِ حیات میں فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔

انسان درختوں کو بعض الوہی اور لائق تقلید خصائص مثلاً ہمت، استقلال، پامردی اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی روش کا مظہر بھی گردانا جاتا ہے۔ اسی طرح مذاہب میں جنگل کو تقدس حاصل ہے اور درختوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ مذہبی تقریبات میں رسوم کی ادائیگی میں درختوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ قدیم ایران میں رسم تھی کہ نوجوان شادی شدہ لڑکیاں اپنے پیٹ پر پیڑ کا گودنا (Tatoo) گدوا لیتی تھیں کہ یہ افزائش نسل کا نیک شگون تھا۔ اسی طرح، ہندوستان کے بعض علاقوں میں بانجھ پن کو دور کرنے کے لئے پیڑوں پر لال رنگ کے رومال باندھنے کا ٹوٹکا رائج ہے۔ جنوبی ہند میں نوبیاہتا مادہ اور نر پیڑ لگاتے ہیں تاکہ ولادت کا سلسلہ شروع ہو سکے۔ مصری اساطیر کے مطابق خدا جنت کے مشرقی دروازے پر درخت پر ایستادہ ہے۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کا عقیدہ ہے کہ روحیں درختوں پر جمع ہو کر انتظار کرتی ہیں کہ کوئی عورت پاس سے گزرے تو وہ اس میں حلول کر جائیں اور پھر بچے کی صورت میں دوبارہ جنم لے سکیں۔ مسلمان پیڑ کی شاخیں قبر پر رکھے جانے کا التزام کرتے ہیں تاکہ عذاب قبر سے بچا جا سکے۔ حضرت عیسیٰ کے یوم ولادت پر گھروں میں درخت لگانے کا رواج عام ہے۔

یوگ میں ایک ایسا آسن ہوتا ہے جس میں جسم کے وزن کو مرتکز کر کے زمین کے

اندر دھنس جانے کی کیفیت کا احساس کیا جاتا ہے اور با نہیں درخت کی شاخوں کی طرح پھیلی ہوئی رکھی جاتی ہیں۔ یہ آسن زمین سے جڑے ہونے اور نمو پذیری کا اشاریہ ہے۔

ہندوستان کی ثقافتی مذہبی سائیکی اور اجتماعی لاشعور کا کوئی حوالہ جنگل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ہے۔ رامائن، مہابھارت اور پرانوں کے متن کی بافت پر جنگل اور دیگر مظاہر فطرت نمایاں نظر آتے ہیں۔ استحصال سے یکسر پاک معاشرہ 'رام راجیہ' بنواس کے بغیر قائم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زندگی کرنے کی ممکنہ تمام صورتوں کے بیک وقت مشاہدہ اور اثبات کا واحد ذریعہ جنگل ہے۔ عرفان الٰہی اور عرفان ذات کے دشوار گزار مراحل خاموشی اور سناٹے سے معمور مظاہر فطرت، علی الخصوص جنگل کی معاونت کے بغیر طے نہیں کیے جاسکتے۔ اسی طرح معاشرتی رسوم و قیود سے بغاوت کرنے والوں مثلاً مجرموں کی پناہ گاہ بھی جنگل ہی ہے۔ انسان کی حیاتیاتی بقا کا انحصار درختوں پر ہے۔ جانور اور درندے کس طرح انسانی زندگی کو ثروت مند بناتے ہیں اور بھیدوں سے بھری زندگی کے اسرار و رموز کے در انسان پر وا کیے جاتے ہیں، اس کا مشاہدہ جنگل میں کیا جاسکتا ہے۔

انسانی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ مظاہر قدرت کو بھی شخصی ملکیت کے تابع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور جنگل بھی انسانی حرص و آز کا ہدف ہے۔ انگلستان کے نارمن دور میں بادشاہ ولیمس نے پہلی بار جنگلوں کی حد بندی کی اور اسے مملکت کی قلمرو میں شامل کرنے کا آغاز کیا۔ جنگل سے مراد ایسا قطعہ زمین تھا جس پر ایستادہ درخت بادشاہ کی مملکت تھے اور یہ علاقہ اس کی شخصی شکارگاہ بھی تھا۔ عوام کو بغیر اجازت یہاں رہنے یا لکڑیوں، پھل، پھولوں اور دیگر اشیا کے استعمال کی آزادی نہیں تھی۔

انسانی زندگی کی کلیت کا ادراک جنگل کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ حیاتی اور ذہنی زندگی کے بنیادی رمز کو ہمارے عہد کے آشوب کا تخلیقی رزمیہ قلم بند کرنے والے شاعر شکیل اعظمی نے پا لیا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار جنگل کا ایک ایسا

ہمہ حسی (Multi-Sensory) نگارخانہ تشکیل دیا ہے جس میں تخلیقی ارتفاع اور حسیاتی مدارات کے امکانات بیش از بیش موجود ہیں۔ شکیل اعظمی کے نزدیک جنگل کی شناخت صرف انسان کی موجودگی یا اس کی عدم موجودگی سے متعین نہیں ہوتی اور یہ کہنا خام خیالی کے سوا کچھ اور نہیں:

'مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے'

جنگل کی اداسی انسانی وجود سے کہیں زیادہ گہری، بسیط اور پہلو دار ہے۔ تنہائی زندگی کی ازلی صداقت ہے اور انسان تنہا رہ کر خود کو ایک الوہی صفت سے متصف کرتا ہے کہ خدا بھی تنہا ہے۔ تنہائی سے زرخیزی کو متحرک کرنے کا ہنر انسان کو جنگل نے سکھایا ہے۔ شکیل اعظمی نے تخلیق اور تکوین کائنات میں سناٹے کے عمل کو جنگل کے وسیع تر تناظر میں ایک حسی وقوعہ کے طور پر پیش کیا ہے:

پنچھی اپنے آپ میں گم ہیں، ہوا بھی چپ سناٹا بھی
بھرا پرا جنگل ہے لیکن کتنا تنہا جنگل ہے

جنگل کے تنوع، تغیر اور انتشار سے کسی نوع کا عدم ارتباط یا بے ہم آہنگی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس سے فطری معصومیت ہویدا ہوتی ہے جسے شاعر کی نکتہ رس نگاہ بچوں کی معصومیت سے تعبیر کرتی ہے:

کہیں پرندے، کہیں جانور، کہیں پہ تتلی، کہیں پہ پھول
بچوں کے سامان کے جیسا بکھرا بکھرا جنگل ہے

درخت تسلسل حیات اور الگ الگ وجود میں منقسم اشیا میں اتصال باہمی کا استعارہ بھی ہیں۔ انسان اپنی مقصد برآری کے لیے درختوں کو طرح طرح سے استعمال کرتا ہے اور اسے مختلف ہیئتوں میں ڈھالتا ہے مگر ان کے بنیادی ساختیہ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ان میں نمو اور زرخیزی اور پھر سے اپنی اصل کی طرف لوٹ جانے کا امکان ہمیشہ

توانا رہتا ہے۔ شکیل اعظمی کی نظم "پیڑ کبھی نہیں مرتا ہے" کے عنوان سے بظاہر ادعائیت اور قطعیت مترشح ہوتی ہے مگر شاعر نے اپنے اس Assertion کا ایسا تخلیقی جواز فراہم کیا ہے جو قاری کو مسخر کرنے پر قدرت رکھتا ہے:

گھر میں جو فرنیچر ہے/ اس کو دھوپ ہوا پانی سے/ دور رکھو/ کرسی میز
میں/ الماری میں/ جانے کب پتے آ جائیں/ کسی کو بھی معلوم نہیں/
جیسے بار ر فلموں میں/ آتمائیں بھٹکتی ہیں/ ویسے ہی موسم میں چھپ کے
/ پیڑوں کی روحیں رہتی ہیں/ اوپر سے کالا کر دو یا پیلا کر دو/ اندر پیڑ
ہرا رہتا ہے/ پیڑ کبھی نہیں مرتا ہے

پتوں، شاخوں اور جڑ سے عاری خشک پیڑ، جس کی ہیئت بھی یکسر بدل گئی ہو، قوت نمو سے عاری نہیں ہوتا۔ چوب خشک ظاہری زیبائش اور آسائش کا ذریعہ بننے کے باوجود بعض حشرات الارض مثلاً دیمک کو تغذیہ فراہم کرتی ہے جس سے فیض مسلسل کا اثبات ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی مٹی میں مل جانے کے بعد اپنی دستیابیوں اور کامرانیوں سے تحرک حیات کا باعث بنا رہتا ہے۔ شکیل اعظمی کی یہ نظم غیر متجانس عناصر میں موجود ایک پر اسرار قوت ثقل کی موجودگی کا بیانیہ رقم کرتی ہے جس سے تازہ کاری بھی منکشف ہوتی ہے۔ مظاہر فطرت میں تکرار اور یکسانیت کے عمل سے شیرازۂ حیات مرتب ہوتا ہے مگر اس کی اساس Binary یا تفریق پر استوار ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنے خلقی تضاد سے صورت پکڑتی ہے اور ہر چیز میں کسی دوسری شے کا عکس شامل ہوتا ہے اور یہ متضاد عناصر ایک نامیاتی کل کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ اس فلسفیانہ قضایا کو شعری منطق میں ڈھالنا آسان نہیں ہے۔ شکیل اعظمی نے مطبوعہ لفظ (Printed Word) پر قائم مروجہ آہنگ سے خلاقانہ طور پر اجتناب کرتے ہوئے Spoken Word کی وساطت سے ایک نیا شعری محاورہ قائم کیا ہے۔ انہوں نے کائنات کے عناصر ترکیبی کے باہمی

ربط کو جس میں تضاد کو اساسی اہمیت حاصل ہے، جنگل سے ماکوذ Analogy کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم جنگل کی تجسیم پر مبنی ایک نوع کی خود کلامی ہے جس میں گفتگو کی برجستگی پیدا ہوگئی ہے۔ مکالماتی منظرنامہ کو محیط یہ شعری کائنات ایک نئی فضا کا احساس کراتی ہے۔ جنگل اپنی کلیت میں مختلف رنگوں میں منقسم ہو جانے کے باوجود ایک ایسی وحدت کے طور پر نمودار ہوتا ہے جو خود مکتفی نہیں ہے بلکہ اس کے وجود کا اثبات متخالف عناصر کرتے ہیں:

میں جنگل ہوں/ سبھی جانور/ سبھی پرندے/ ساری گھاسیں/ سارے
پودے/ اونچے نیچے سبھی درخت/ سب میرا ہی حصہ ہیں/ روزانہ
سونے سے پہلے/ میں خود کو گنتا رہتا ہوں/ ہر گنتی میں تھوڑا تھوڑا کم لگتا
ہوں/ کٹتا ہوں/ زخمی ہوتا ہوں/ مرجاتا ہوں/ پھر بھی میں زندہ رہتا
ہوں/ دریا مجھ کو بھیتر بھیتر کاٹ رہا ہے/ میں دریا کی موجوں کے
اوپر بہتا ہوں/ میرے اندر میں ہی صرف نہیں رہتا ہوں/ پانی بھی
ہے آگ بھی ہے/ ہوا کا مجھ میں راگ بھی ہے/ ناچوں بھی میں گاؤں
بھی میں/ چیخوں بھی چلاؤں بھی میں/ روتا بھی ہوں کبھی کبھی میں/
میرے اندر درد بھی ہے/ رنگ ہرا ہے میرا لیکن/ ہرے کے نیچے زرد
بھی ہے

رنگوں کی علیحدہ علیحدہ شناخت پر اصرار فہم انسانی کے تفاعل پر سوالیہ نشان قائم کرتی ہے کہ ہر رنگ بیک وقت موجود رہتا ہے اور کوئی رنگ کسی دوسرے کی نفی نہیں کرتا۔ پہچان کے مانوس حوالے متعین کرنا ہمارے عہد کی مقبول روش ہے اور اسی انسانی ڈائلیما (Dilemma) کے سلسلے میں ٹی ایس ایلیٹ نے لکھا تھا کہ انسانی سرگرمیوں کا اصل مقصود شناخت کی تعریف متعین کرنا ہے (To fix in a formulated phrase)

رسمی منطق کی رو سے تضاد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے ادراکِ انسانی کی نفی ہوتی ہے مگر ہیگل نے اپنی تصنیف جدلیات میں لکھا ہے کہ ہر تصور یا نظریہ میں تضاد کا عنصر نمایاں رہتا ہے اور یہی اس تصور کا لمحۂ لازمی (Essential Moment) ہے۔ جنگلوں کو مرکوز شاعری وجود کی کنہ میں موجودہ امکانات، جو تضاد کے رشتے سے منسلک ہیں، انسانی مجادلہ کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ انسان اپنی اصل میں امکانات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور اس کا مکمل ادراک سب سے پُر قوت مظہر ِفطرت 'جنگل' کی وساطت سے کیا جا سکتا ہے۔ راون اور ہنومان ہر انسان میں بیک وقت سانس لیتے ہیں۔ انسانی سائیکی کی یہ تفتیش جنگل کے محور پر گردش کرتی ہے جسے شکیل اعظمی ایک تشبیہی علاقے کا سرنامہ بناتے ہیں:

میں ہی راون بھی ہوں، ہنومان کی سینا بھی میں
میں ہی گھائل ہوں مجھے کوئی دوا دے جنگل

سر پر ہیں الزام ہزاروں
پھر بھی کتنا بھلا ہے جنگل

پاگل، وحشی، ان پڑھ، جاہل
تجھ پہ سو الزام ہے جنگل

ہر شے کی خلقی صفت اس کی ازلی صداقت نہیں ہے۔ اس کے امتیازات اس کی مکمل تفہیم کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں اور سوالوں کے لامتناہی سلسلے کو متحرک کرتے ہیں۔ شئے کے اثبات سے اس کی شیئیت (Thingness) کو Subvert کیا جا سکتا ہے۔ شکیل اعظمی نے اس کیفیت کو مکالماتی پیرایہ اظہار میں ڈھالا ہے اور گفتگو کے الفاظ (Coversational Word) سے اپنی غزل کا ڈھانچہ مکالمہ پر استوار کیا ہے۔

اس کی ردیف ’بھائی‘ سے باہمی قربت مترشح ہوتی ہے اور تخاطب کا انداز بھی پیدا ہوتا ہے۔ صحرا کی ویرانی جنگل کو حیران کرتی ہے اور پربت کے شکوہ اور ہمہ گیری میں وادی کو خدا کی ایک شکل نظر آتی ہے:

جنگل نے صحرا سے پوچھا
کیوں اتنے ویران ہو بھائی
وادی نے پربت سے پوچھا
کیوں بنتے بھگوان ہو بھائی
پیڑوں نے دریا سے پوچھا
لاتے کیوں طوفان ہو بھائی
کوے نے طوطے سے پوچھا
کیوں اتنے نادان ہو بھائی
کوئل نے کوے سے پوچھا
کیوں اتنے شیطان ہو بھائی
تتلی نے اک پھول سے پوچھا
کیوں مجھ سے انجان ہو بھائی

انسان اور دیمک میں مماثلت یہ ہے کہ یہ دونوں زیر پردہ طور پر سرگرم عمل رہتے ہیں جس کا احساس ناقابل تلافی نقصان کا شکار ہونے والے کو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ شکیل کا شعر دیکھیے:

لکڑی نے دیمک سے پوچھا
کیا تم بھی انسان ہو بھائی

شکیل اعظمی نے عوامی حافظہ کو منور رکھنے والے اشخاص اور تہذیبی مظاہر کو اردو

شاعری کی سکہ بند لفظیات اور مانوس آہنگ سے اپنی شعری کائنات کا تشخص قائم نہیں کیا ہے بلکہ Spoken Word کی برجستگی اور ارتکاز سے عوامی تہذیب کی مرتعش صورت گری کی ہے۔ اردو میں عام طور پر نظیر اکبر آبادی کو پہلا مستند عوامی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ان کی تحسین بھی کی جاتی ہے اور انہیں ہدفِ تنقیص بھی بنایا جاتا ہے۔ اشرافیہ شعریات شاعری کو سماجی شعور کا مظہر اور معاشرتی تبدیلیوں کی راہ ہموار کرنے کے ذریعے کے طور پر قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یہ ادبی نظریہ شاعری کی عوامی آرزومندیوں کی تکمیل کے تصور کی تکذیب کرتا ہے۔ شکیل اعظمی کے شعری سرمایہ پر، جو سات مجموعوں پر مشتمل ہے، بیک وقت نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی کلچر کے مانوس مظاہر کی نمائندگی یا ان کی بے محابا تحسین تخلیقی دبازت کی ضامن نہیں ہوتی۔ اجتماعی تخلیقی حسیت کو منعکس کرنے والی فراموش کردہ جہتیں شاعری کو ایک حسی روداد کی صورت عطا کرتی ہیں جہاں الفاظ محض کسی شے کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ صوت و صدا کی ایک منفرد کائنات وضع کرتے ہیں۔ یہاں شاعری رقص، موسیقی، مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ کا ایک خوبصورت کولاژ بن جاتی ہے۔ شکیل اعظمی کی بعض نظمیں پڑھ کر مشہور امریکی ڈرامہ نویس، فکشن نگار اور ناقد ایمری برا کا (Amiri Baraka, 1934-2014) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس کے مجموعے Fun Love (1966) کی بین الاقوامی سطح پر بڑی پذیرائی کی گئی۔ براکا کو PEN اور Beyond Margin ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ شکیل اعظمی کی شاعری میں جدلیاتی، لمسیاتی، سیاسی، تعقلی، عوامی، اجتماعی اور انقلابی امکانات کی موجودگی کا بیک وقت احساس ہوتا ہے اور بصری پیکروں کی بہتات کے باوجود شاعری زبانی روایت کی قابلِ رشک توسیع کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ جس کا آہنگ بولے گئے لفظ، رقص، موسیقی اور بصری منظر ناموں کے جلوۂ صد رنگ سے قائم ہوتا ہے۔ خاموشی کس طرح خوابناکی اور تابناک ترانفرادی تشخص کا سب سے موثر وسیلہ بنتی ہے، اس

استفسار کا سب سے بہتر اظہار شکیل اعظمی کی ایک غزل جس کی ردیف 'سناٹا جنگل اور میں' ہے، کرتی ہے۔ آوازوں کی کثرت میں خاموشی ہی مسکت ذریعۂ ابلاغ ہے:

آوازوں کے اس میلے میں اپنی بھاشا سمجھے کون
بن بولے سب کچھ کہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

جذبات کے بے محابا اظہار سے گریز پائی اور بردباری جنگل اور انسان کو ایک گہرے حیاتی رشتے سے منسلک کرتی ہے جس کا حوالہ سناٹا اور Gaps ہیں:

صدیوں سے چپ رہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں
اسی لیے تو دکھ سہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

شاعر کے نزدیک دکھ غم کا مترادف نہیں بلکہ دکھ کا التباس ہے۔ یہاں یک گونہ مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ دکھ ہی باعث طمانیت ہے، یہی اس شعر کا رمز ہے۔

جنگل انسانی صورتحال کی ایسی تمثیل ہے جس کی پاسداری کرنا زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ جنگل کی موسیقی ہی انسان کی اندرونی توانائی اور بقا کی ضامن ہے۔ یہاں پر شور آہنگ میں المیاتی احساس بھی پنہاں ہے جیسے راگ درباری میں، جو فتح و نصرت اور سرشاری کا راگ ہے، ایک سُر اداسی کا بھی لگتا ہے۔ تان سین نے مغلوں کے عروج میں بھی ان کے زوال کی پیش قیاسی کر لی تھی۔ شکیل اعظمی کی ایک قدرے طویل نظم 'جنگل کا آرکسٹرا' نے جنگل جن آوازوں سے آباد رہتا ہے، مثلاً پرندوں کا چہچہانا، چڑیوں کا شور، ہوا کی سرسراہٹ، ندیوں کا بہنا، پہاڑوں سے پتھروں کا گرنا، پکے ہوئے پھلوں کا درختوں سے ٹپکنا، کو ایک منفرد شعری آہنگ عطا کیا ہے۔ صدا ہی انسانی وجود کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ امتناع بھی اور جنگل میں اس کی ممکنہ تمام صورتوں کا ادراک کیا جا سکتا ہے:

بھول کے اپنے پاؤں کا دکھ/ بجا رہا ہے مور ستار/ مینا اور بلبل کی بھی/ لے ابھری ہے پیار بھری/ زخمی چیتا پنجوں سے/ بجا رہا ہے کہیں گٹار/ دوڑ بھاگ سے تیندووں کی/ ابھر رہی ہے کتھک پڑھنت/ ترکٹ ترکٹ ترکٹ دھا/ تک دھن تک دھن تک دھن دھا/ ہارمنی ہے ہمنگ بھی ہے/ پانی میں سنگنگ بھی ہے/ دھیرے دھیرے چلی ہوا/ وائلن سی بجی ہوا/ محبوبہ کی زلفوں سی/ مہکی مہکی کھلی ہوا/ بنسواڑی میں کھڑک اٹھے/ پھر کھڑتال مجیروں سے/ سبھی جانور سبھی درخت/ صوفی سنت فقیروں سے/ جیسے تمبا کہیں بجے/ زمیں پہ ٹپکے ایسے آم/ الکھ نرنجن، اللہ ھو/ کہیں ہے مولا کہیں ہے رام/ بانسوں کی رگڑن کا تاؤ/ آموں کی ٹوٹن کا گھاؤ/ مینا اور بلبل کی آس/ کوئل کی برسوں کی پیاس/ شیروں کے غصے کا رنگ/ پتھر سے پتھر کی جنگ/ پیڑوں کے اندر کا غم/ ہاتھی کا رہنا برہم/ چڑیوں کے یہ من کی آگ/ ہوا کا ہے یہ بھیگا راگ/ آنسو سے لکھا گیت ہے یہ/ دل سے نکلا سنگیت ہے یہ/ سنگیت میں سات سمندر ہے/ جنگل بھی کیا کمپوزر ہے

صوت وصدا کی ممکنہ تمام صورتوں سے آباد جنگل کی ایسی متحرک بصری اور سمعی تمثیل اردو شاعری میں پیش نہیں کی گئی۔ اس لحاظ سے یہ نظم ایک خاص موضوع کو فنی چابکدستی کے ساتھ ایک منفرد پیرایہ اظہار عطا کرتی ہے۔

جنگل مظاہر فطرت کو بوقلمونی کے باوجود باہمی رشتہ یگانگت سے منسلک رکھتا ہے گو کہ مطابقت قائم رکھنے کے حوالے سطح پر نمایاں نہیں ہوتے۔ جنگل کی اندرونی توانائی ان تمام مظاہر میں مرکزی قوت نمو کے طور پر جاری وساری رہتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جنگل پہاڑ کو بغیر کسی خارجی سہارے کے ایستادہ رکھتا ہے۔ رسی اور تار خارجی حوالے ہیں

جن پر انحصار نہیں کیا جا سکتا ہے:

پربت کو باندھے رکھتا ہے
رسی ہے نہ تار ہے جنگل

جنگل بازار کا نقطہ آغاز بھی ہے اور اس کی نت نئی شکلوں کے حصول اور ترویج کا وسیلہ بھی۔ بازار کے ذکر میں عموماً تحقیر کو روا رکھا جاتا ہے کہ بازار حقیقت بھی ہے اور آڈمبر بھی۔ بازار میں جاگیردارانہ تہذیب کے زوال اور جمہوری اقدار کے فروغ کا بھی ایک نکتہ پوشیدہ ہے۔ پہلے شرفا خرید و فروخت کے لئے بازار نہیں جاتے تھے بلکہ دکاندار اور تاجران کے گھر پر سامان لے کر پہنچتے تھے مگر اب صورت حال بدل گئی ہے۔ شکیل اعظمی نے بازار کا بیان تو کیا ہے مگر ان کے ہاں بازار سے متعلق خراب رائے کا پامال موضوع تکرار کی صورت نہیں ابھرتا بلکہ ان کے ہاں بازار اور جنگل کے ربط کا ایک نیا تناظر قائم ہوتا ہے:

پہلے کاٹا گیا، پھر کاٹ کے جوڑا بھی گیا
پھر نئی شکل میں بازار سے جنگل نکلا

فنا اپنی ہمہ گیری اور لامتناہی امکانات میں جنگل کے مماثل ہے کہ جنگل تسلسل حیات اور وسعت کا آئینہ دار ہے۔ دنیا برباد ہو کے آباد ہوتی ہے، اسی طرح فنا اور بقا ایک دوسرے کی تکذیب نہیں بلکہ تکملہ کرتے ہیں۔ اسی لیے شکیل اعظمی کے نزدیک دنیا فنا کے جنگل کے سوا کچھ اور نہیں:

ایک دن پیڑ سبھی جڑ سے اکھڑ جائیں گے
بات مانو مری، دنیا ہے فنا کا جنگل

جنگل مشاہدہ کائنات اور خودشناسی کی راہیں روشن کرتا ہے اور معرفت الٰہی کا ذریعہ

بھی بنتا ہے۔ مظاہر قدرت محض آیات خداوندی ہی نہیں بلکہ خدا کے وجود کو پوری شدت کے ساتھ قائم کرتے ہیں:

غور سے دیکھو خدا دکھے گا
مانو تو بھگوان ہے جنگل

انسانی بصیرت اور دانائی کی سب سے بہتر نمائندگی شعر و ادب کرتا ہے جو زندگی کے متنوع، گہرے اور پیچیدہ تجربات سے قاری کو آشنا کرتا ہے۔ اچھی شاعری اپنی اصل میں بے کنار ہوتی ہے جو جنگل کا طرہ امتیاز ہے۔'بنواس' کے شاعر پر یہ نکتہ اچھی طرح عیاں ہو چکا ہے:

تلسی داس کی رامائن ہے
غالب کا دیوان ہے جنگل

اک آواز ہے ہر پتے میں
پھر بھی کیوں سنسان ہے جنگل

لفظ، صوت و صدا اور برش قلم کو محیط کارِ تخلیق کے آگے کائنات گیر اعمال و افعال بھی ہیچ ہیں اور شاعر کو اپنی تخلیقی فطانت کے مقابلے میں جنگل کی کارکردگی بے مایہ نظر آتی ہے:

موسم بدلے، ہوا چلائے
یہ بھی کوئی کام ہے جنگل

آب رواں بھی فراق نصیب عاشق کے آنسوؤں کا رہین منت ہے۔ آنسو انسانی وجود کی تنزیہہ کرتا ہے اور اسے قوت نمو فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح پانی کے بغیر جنگل کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے:

ہوائیں لے اڑی تھیں ایک دن میرے سبھی آنسو
پھر اس کے بعد اک آب رواں جنگل سے نکلا تھا

جنگل خود کفالت کا مظہر بھی ہے۔ یہ مسائل پیدا بھی کرتا ہے اور ان کا ازالہ بھی کرتا ہے۔ مسئلہ اور حل کی بیک وقت دستیابی سے انسانی معاشرہ آشنا نہیں ہے۔ یہ انسانی Utopia ہے جس کی عملی صورت جنگل ہے:

دنیا ہے پانی ہی پانی
کشتی ہے، پتوار ہے پانی

خود کو زندہ رکھنے کے لیے ہر شئے غذا کی محتاج ہوتی ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ تغذیہ عموماً باہر سے حاصل کیا جاتا ہے جس سے نشو و نما ہوتی ہے۔ اس ضمن میں جنگل کی مرکزی شناخت 'درخت' کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ پیڑ، ہوا، پانی، روشنی اور کھاد تو خارج سے حاصل کرتے ہیں مگر ان کو خود کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے اجزائے ترکیبی کی قربانی دینا ہوتی ہے۔ خود کو قربان کرنا افزائش کا باعث ہے۔ خزاں میں درخت بڑی حد تک خود سے عاری ہو جاتا ہے یعنی اپنے پتے گرا دیتا ہے۔ پت جھڑ کی بھوک ہی درختوں کی بقا کی ضامن ہے۔ شکیل اعظمی نے اس عام مظہر کو شعری پیکر عطا کیا ہے:

پت جھڑ کو پھر بھوک لگی تھی
پت جھڑ نے پھر چرا ہے جنگل

'بنواس' میں جنگل ردیف میں 18 غزلیں ہیں اور اس کے متعلقات لکڑی، پیڑ، پرندے، جانور، بھیڑیا لکڑہارا کو بھی ردیف بنایا گیا ہے۔ جنگل کی صفت جنگلی ہے جس سے عموماً وحشت، جہالت، توہم پرستی اور جلد برافروختہ ہونے کی کیفیت مراد لی جاتی ہے۔ دانستہ طور پر رنج کھینچنے والے اور نقصان اٹھانے والے اہل دنیا کے نزدیک ناسمجھ اور جنگلی ہوتے ہیں۔ جان بوجھ کر اپنی راہ کھوٹی کرنے میں ایک نکتہ دانش مندی اور

فراست کا بھی ہوتا ہے جس سے اہل علم واقف ہیں۔ مگر ایسے پڑھے لکھے عام انسانوں کے نزدیک نا سمجھ ہی ہوتے ہیں:

کانٹے خود اپنی راہ میں بوتا ہے جنگلی
اکثر پڑھے لکھوں میں بھی ہوتا ہے جنگلی

مچھلی کے ساتھ جنگلی کی صفت استعمال نہیں کی جاتی۔ شاعر کے نزدیک کائناتی مظاہر میں جب توازن درہم برہم ہوتا ہے اور قدرتی آفات بے جان اشیا کے ساتھ ہر ذی روح کو متاثر کرتے ہیں تو ان کا عمل بھی بدل جاتا ہے۔ مچھلی کو دانش، زرخیزی اور خوش حالی کے مظہر کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور اس سے نیک شگون مراد لیا جاتا ہے۔ سلطنت اودھ کا شاہی نشان دو مچھلیاں تھیں جو محلوں کے دروازوں پر آویزاں رہتی تھیں۔ پانی اگر جنگل تک پہنچ جائے اور وہاں سیلاب کی سی کیفیت پیدا ہو جائے تو مچھلیوں کا وہ عمل نہیں ہوگا جو ندی میں ہوتا ہے۔ مچھلیوں کا برتاؤ غیر متوقع اور خلاف معمول ہوگا۔ اس سلسلے میں شکیل اعظمی کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

آج کل میرے جنگل میں سیلاب ہے
ہو گئی ہیں سبھی مچھلیاں جنگلی

غصہ باعث بربادی ہوتا ہے۔ اکثر غصے کا برملا اظہار نہیں کیا جاتا مگر یہ اندر ہی اندر پنپتا رہتا ہے۔ اگر اس کے ازالہ کی صورت نہ کی گئی تو پھر یہ باعث ہلاکت ثابت ہوتا ہے۔ یہ تو انسانی صورت حال ہوئی مگر جنگل میں سکونت پذیر سانپ میں زہر کیوں پیدا ہوتا ہے، اس کی حیاتیاتی اور سائنسی تاویل کچھ بھی ہو، شاعر کے نزدیک سانپ کا نیلا ہونا (زہر کا رنگ نیلا تصور کیا جاتا ہے جس کا تعلق شیو جی سے ہے)، دراصل غصے کو پی جانے کا نتیجہ ہے۔ شاعر شاید یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ قوت برداشت لاکھ اچھی سہی مگر اس کی بھی حد ہوتی ہے اور اگر اس کا سلسلہ لامتناہی طور پر جاری رہے تو پھر انسان کی شخصیت مسخ ہو

جاتی ہے:

پی کے اپنے غصے کو

ہو جاتے ہیں نیلے سانپ

اسلحہ یا جسمانی طاقت سے کہیں زیادہ مہلک شکاری کی آنکھ ہوتی ہے۔ قاتل کی آنکھ سفاکی اور ظلم کا احساس کراتی ہے، یہی سبب ہے کہ ظلم و ستم کا شکار بننے والا Eye to eye contact سے بچنا چاہتا ہے:

آساں نہیں ہے اس کی آنکھوں میں جھانکنا

بیٹھا ہوا ہے جیسے کاجل میں بھیڑیا

پیڑ نہ صرف افزونیِ حیات کا حوالہ ہیں اور زندگی کی رنگارنگی اور رشتوں کی حرارت ان سے قائم ہوتی ہے۔ پیڑ تمام انسانی رشتوں کی تلافی بھی کرتے ہیں اور انسان کا جسمانی سہارا بھی بنتے ہیں۔ معاشرتی اور اخلاقی معاونت بھی پیڑ پودے کرتے ہیں:

پودے سارے بھیا، بابو، دیدی، بہنی، دوست

اماں، ابا، دادا، دادی، نانا، نانی پیڑ

محل ہے جنگل، برگد، پیپل، سارے چوکیدار

آم اور املی بنے ہوئے ہیں راجہ رانی پیڑ

کسی بھی مقبول عام نظریہ کی مختلف جہتوں اور معاشرہ پر اس کے مثبت اثرات کا ایک تحسینی بیانیہ اپنے اختتام سے اس تصور کے وجود پر کیسے سوالیہ نشان قائم کرسکتا ہے اور طاقت ور (صاحب اقتدار) کس طرح باہمی یگانگت اور آزادیٔ رائے کا دم بھرنے کے باوجود محکوموں کا استحصال کرتے ہیں اور انہیں لقمۂ تر کی صورت استعمال کرتے ہیں۔ اس عام مشاہدہ کی خیال انگیز تعبیر شکیل اعظمی کی نظم جنگل میں ڈیموکریسی ہے۔

طاقت اپنی اصل میں استحصالی ہوتی ہے۔ طاقت کے غلط استعمال (Misuse) کی بات کرنا بے معنی ہے کہ طاقت Misuse کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ شاعر نے ابتدا میں جنگل میں اقتدار کے مرکز شیر کی قلب ماہیت کا ذکر کیا ہے جو تمام جانوروں کو آزادی دے رہا ہے اور حاکم کا فیصلہ ان کی صوابدید پر چھوڑ رہا ہے۔ جس جانور کو سب سے زیادہ ووٹ ملیں گے وہی عنانِ حکومت سنبھالے گا۔ اس اعلان سے پورے جنگل میں جشن کا سماں پیدا ہوگیا ہے:

ہرن کے بچے بے فکری میں
اسکولوں سے لوٹ رہے ہیں
شام ہوئی ہے طوطا مینا
شہر سے ڈی جے لے آئے ہیں
سبھی جانور سبھی پرندے
ناچ رہے ہیں، جھوم رہے ہیں
آزادی سے گھوم رہے ہیں

الیکشن کرانے اور آزادی فراہم کرنے کا نعرہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کا التباس (Illusion) پیدا کرتا ہے جس سے معصوم جانور (انسانی معاشرہ میں عام انسان) مسحور ہوجاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ استحصال ان کا مقدر ہے اور ان کی جانوں کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ شکیل اعظمی نے فنی ہنر مندی کا ثبوت دیتے ہوئے استحصال کی عملی شکل کا براہ راست بیان نہیں کیا بلکہ آخری شعر کا ڈھانچہ Irony پر استوار کر دیا ہے:

جنگل میں سب ٹھیک ٹھاک ہے
پر شیروں کو بھوک لگی ہے

اس سے جمہوریت کی بے بضاعتی اور عوامی آرزومندیوں پر پورا نہ اترنے کی

حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔

بہت سے پیڑ بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ شکیل اعظمی نے اپنے اس مجموعے میں ایسے متعدد پیڑوں پر الگ الگ نظمیں لکھی ہیں اور ان پیڑوں کے معروف خصائص اور استعمال کی صورتوں کو حیاتی تناظر عطا کیا ہے۔ 'بنواس' میں ببول، بیر، مہوا، آم، جامن، املی، برگد، پیپل، پاکڑ، گولر، تاڑ، نیم، شیشم اور بانس وغیرہ پر نظمیں شامل ہیں۔ گولر کا پھول کسی نے نہیں دیکھا اور یہ عنقا ہونے کے محاورہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گولر کا پھول ہی دراصل اس کی روح ہے اور انسانی روح کی طرح اس کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ گولر کا پھول جب انسانی تصرف میں آتا ہے تو یہ بے روح ہو چکا ہوتا ہے۔ شکیل اعظمی کی نظم 'گولر' ایک پرانی اور معروف صنعت حسن تعلیل کو آج کے محاورۂ بیان میں قائم کرتی ہے:

'گولر'

پھول بنا ہی پھل آتا ہے
جانے پھول کہاں جاتا ہے
گولر کے اندر ہوتی ہے
چمکیلے پنکھوں والی
اک چھوٹی سی چڑیا بھی
جب بھی گولر کھانے جاؤ
پھول چرا کر اڑ جاتی ہے

اسی طرح املی ذائقہ کی مختلف سطحوں کا ادراک کراتی ہے اور انسانی زندگی کی طرح ہر رنگ میں بہار کا اثبات کراتی ہے۔ شکیل کی مختصر نظم ملاحظہ کریں:

'املی'

بن کھائے ہی

دانت کے نیچے

دبی ہوئی ہے کھٹاس کوئی

کھٹاس میں ہے مٹھاس کوئی

منھ میں پانی بھرا ہوا ہے

گزران وقت کے مختلف پہر جنگل میں کس طرح گذرتے ہیں اس کی منظرکشی شکیل اعظمی نے اپنے منظر ناموں میں کی ہے۔ جنگل کی صبح، جنگل کی دوپہر اور جنگل کی شام کو محیط شعری منظر نامے پیکر تراشی سے شاعر کے شغف اور مہارت کو ظاہر کرتے ہیں:

'جنگل کی شام'

اک سندور کی ڈبیہ سا/ سورج ابھی گرا تھا کھل کے جنگل پر/ لیکن ابھی ابھی سیاہی بھی/ پھیل گئی ہے پیڑوں پر/ جنگل کے گوشے گوشے میں/ اتر رہی ہے تاریکی/ ایک عجب سا رہسیہ ہے جو/ دھیرے دھیرے اپنے پاؤں پسار رہا ہے/ جنگل کی تاریکی پل میں/ گھنی رات میں ضم ہوتی ہے/ عمر شام کی کم ہوتی ہے

جنگل کی صبح کے منظر کا بصری پیکر تو جاذب نظر آتا ہے:

فضا میں بھاپ سی پھیلی ہوئی ہے/ فلک سے جھانکتا سورج/ بہت باریک کرنوں سے/ درختوں کی دراریں بھر رہا ہے/ ہرے پتے سنہرے ہو گئے ہیں/ کہیں جانے کی تیاری میں جنگل سج رہا ہے/ پرندوں کا الارم بج رہا ہے

جنگل میں تپ کرنے والے مہاپرشوں مہاتما بدھ اور مہاویر پر بھی نظمیں ہیں۔

والمیکی ،مہارانا پرتاپ اوراساطیری کردار علی بابا کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔

اردو میں رامائن اوراس کے مختلف کرداروں کو ایک حاوی شعری موتیف کے طور پر برتنے کی قدیم روایت رہی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔علاوہ بریں رامائن کے متعدد منظوم تراجم بھی کیے گئے۔اقبال نے رام پر ایک شاہکار نظم لکھی اور انہیں امام الہند یاروحانی پیشوا قرار دیا۔منظوم رامائن سے قطع نظر رامائن کے مرکزی کرداروں رام، لکشمن اور سیتا وغیرہ پر نظمیں بھی لکھی گئیں مگر اس عظیم الشان رزمیہ کے فراموش کردہ کرداروں کو،جنہوں نے اس پورے وقوعہ کی تکمیل میں اساسی رول ادا کیا ہے،،بہت کم موضوع بحث بنایا گیا ہے۔اس ضمن میں بھرت اور لکشمن کی اہلیہ ارملا کا نام بغیر کسی پس وپیش کے لیا جاسکتا ہے۔بھائی کی محبت میں سرشار اور جنگل میں ان کی حفاظت پر ہمہ وقت مستعد رہنے کے لیے لکشمن نے رام اور سیتا کے ساتھ رخت سفر باندھا۔لکشمن کی اہلیہ ارملا راجہ جنک کی بیٹی اور سیتا کی بہن تھی۔راجہ جنک ارملا کے Biological Father تھے۔سیتا تو کھیت سے پرکٹ ہوئی تھیں۔ارملا ایک سچی پتی ورتا پتنی کی طرح اپنے شوہر لکشمن کے ساتھ جنگل جانا چاہتی تھی مگر لکشمن نے کہا کہ اس کی موجودگی سے رام اور سیتا کی خدمت میں خلل پڑے گا لہٰذا وہ محل میں رہ کر اپنی تین ساسوں کی نگہداشت کرے۔والمیکی نے ارملا کا ذکر صرف تین سطروں میں کیا ہے اور چودہ برس تک تنہائی کا دکھ جھیلنے والی ارملا کی ذہنی اور جسمانی صعوبتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ سیتا جی محل کی آسائشوں کو تج کر کے جنگل گیئں تو ان کے شوہر رام چندر جی ان کے ساتھ تھے مگر تمام مادی آسائشوں کے باوجود ارملا نے فراق (ویوگ) کے اندوہ اور درد کو کس طرح جھیلا اس کے ذکر سے رامائن کے صفحات تہی ہیں۔یہ مسئلہ صرف والمیکی کا ہی نہیں بلکہ بعد کے شعرا کا بھی ہے جنہوں نے ارملا کی عدیم المثال قربانی اور رتیاگ یعنی نوجوان عورت کا 14 برس بغیر شوہر کی رفاقت کے گزارنا،کو شعری حسیت میں منعکس

نہیں کیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اولاً ارملا کے کردار پر ایک تفصیلی مضمون 'اپیکشیتا' (بھولی بسری یا نظر انداز کی گئی عورت) لکھا اور شعرا کو تلقین کی کہ وہ رامائن کے اس نسائی کردار کے درد کو بھی اجاگر کریں۔ اجے بساریہ کے مطابق اچاریہ ہزاری پرساد دویدی نے بھی ارملا سے متعلق ایک تحقیقی اور مبسوط مضمون لکھا۔ ہندی کے معروف شاعر میتھلی شرن گپت نے اپنی طویل رزمیہ نظم 'ساکیت' میں ارملا کی آنکھ کے حوالے سے رام کتھا بیان کی ہے۔ والمیکی رامائن کے علاوہ بھی رامائن کے متعدد Version ہیں۔ ارملا سے متعلق یہ روایت بھی ہے کہ جب رام، لکشمن اور سیتا جنگل میں داخل ہوئے اور رات اتری تو لکشمن نے رام اور سیتا کے تحفظ کی خاطر پوری رات جگنے کا فیصلہ کیا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ نیند سے مغلوب سے ہونے لگے تو پھر انہوں نے نیند کی دیوی 'ندرا' کی اپاسنا کی اور وہ خوش ہوکر پرکٹ ہوئیں تو لکشمن نے درخواست کی کہ انہیں چودہ برس تک نیند نہ آئے تا کہ وہ رام چندر جی کو یکسوئی کے ساتھ تحفظ فراہم کرسکیں۔ دیوی ندرا نے درخواست قبول تو کی مگر یہ شرط عائد کی کہ کسی ایسے کو پیش کیا جائے جو ان کے بدلے میں سوسکے۔ لکشمن نے ارملا کا نام لیا اور ارملا نے اپنے شوہر کا حکم بے چوں و چرا قبول کرلیا۔ شکیل اعظمی غالباً اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے رامائن کے مختلف کرداروں پر علاحدہ علاحدہ نظمیں فن کارانہ شعور کے ساتھ لکھی ہیں۔ ارملا پر ان کی نظم رامائن کے اس فراموش کردہ کردار کی تانیثی حیثیت کو ایک نیا پیرایۂ اظہار عطا کرتی ہے۔ لکشمن کی عدم موجودگی نے ارملا کو زندگی کی رمق سے محروم کردیا تھا اور اپنے شوہر کے حکم کی پاسداری میں اس کا زیادہ تر وقت سوتے گزرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ احساس سے عاری ہوکر پتھر کے مماثل ہوگئی تھی۔ محل کا عیش و آرام اسے Move نہیں کرتا اور اس کا وجود پتھر کی عملی تفسیر بن گیا تھا۔ شکیل اعظمی کی نظم 'ارملا' کے دو شعر دیکھئے:

روح جنگل میں تھی اور جسم محل کے اندر
وہ بھی رہتے ہوئے پتھر میں ہوئی تھی پتھر
دور رہنا پڑا لچھمن سے اسے چودہ برس
وہ محل اس کے لیے ایسا تھا جیسے کہ قفس

چودہ برس کی طویل اور جانگسل جدائی نے ارملا کے حیاتی وجود کو یخ بستہ کر دیا تھا اور وہ خاموشی میں اپنے دکھ کا درماں تلاش کرتی تھی:

درد اس کا کبھی دیوار سے نکلا ہی نہیں
اس میں جو موم تھا وہ دھوپ میں پگھلا ہی نہیں

ایسی خاموشی جو آواز نہ بننے پائی
وہ تھی اک راز جو ہم راز نہ بننے پائی

ارملا کا دکھ اظہار و بیان کی گرفت سے ماورا رہا اور رامائن کی داستان رقم کرنے والے تخلیق کار ارملا کے اتھاہ دکھ سے بے خبر ہی رہے اور مورخ بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ یہ صورتحال تشکیل اعظمی کو خوش نہیں آئی۔ ان کی نظم کی اختتامی سطریں ملاحظہ کریں جو ارملا کے حیاتی وجود کو ایک مرئی پیکر عطا کرتی ہیں:

ایک چنگاری بنا بجھ کے ہوئی راکھ میں راکھ
اس کے اشکوں سے نہ بھیگی کبھی اتہاس کی آنکھ
ایسا کردار کہ جس کا کوئی قصہ بھی نہیں
ارملا رام کے بنواس کا حصہ بھی نہیں

ارملا کی خاموشی اس وقت ایک پرزور صدائے احتجاج بن گئی جب سیتا سے پاکدامنی کا ثبوت مانگا گیا اور رام نے بھی اس مطالبے کی ہمنوائی کی۔ ارملا نے کہا صرف عورتوں کو ہی کیوں ہمیشہ مشکوک سمجھا جاتا ہے اور اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں، کیا

مرد الزام سے بری الذمہ ہیں؟ سورپ نکھا ایک خوبصورت عورت کے بھیس میں رام جی کے پاس آئی اور انہیں اپنی بیوی کو چھوڑ کر اسے قبول کرنے کی تلقین کی۔ کیا سیتا نے رام کے کردار پر انگشت نمائی کی اور کیا انہوں نے بھی اس واقعے کا ذکر کیا؟

شکیل اعظمی نے رامائن کے ایک بے زبان اور بھولے بسرے کردار کو زبان عطا کی ہے جس کے لئے وہ پذیرائی کے مستحق ہیں۔

رامائن میں رام کے سوتیلے بھائی بھرت کو دھرم اور آئیڈیل ازم کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بھرت سے متعلق نظمیں بھی کم ہی لکھی گئی ہیں۔ تامل ناڈو کے ایک مشہور عالم تری پور کرشنن نے اپورو ارامائن میں لکھا ہے کہ بھرت کے کردار کا صحیح طور پر ادراک نہیں کیا جاسکا ہے۔ بھرت نے رام کی عدم موجودگی میں تخت پر بیٹھے بغیر ان کی کھڑاؤں کی معرفت ملک کا انتظام و انصرام کیا۔ اسی طرح بھرت راجیہ ہی رام راجیہ کی اولین شکل ہے اور رام راجیہ کو بھرت راجیہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بھرت کو رام کے ساتھ مکمل وفاداری اور یگانگت کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ بھرت نے ملک کی توسیع میں بھی اہم رول ادا کیا۔ ان کے زمانے میں تکشلا کی سلطنت قائم ہوئی جس کی سرحدیں پنجاب، پاکستان، افغانستان اور مغربی ایشیا کے بعض حصوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پشاور کا نام بھی بھرت کے دوسرے بیٹے پکشل کے نام پر رکھا گیا ہے۔ بھرت کی جہاں بانی رام کے آشیرواد سے غذا حاصل کرتی تھی۔ رام کے تئیں غیر معمولی جذبۂ احترام نے بھرت کو ملبوس شاہی سے بے نیاز کر دیا تھا اور اس طرح ان کے بے لوث اخلاق اور بلید ان کی کوئی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شکیل اعظمی کی نظم کا اختتامی حصہ ملاحظہ کریں:

بھائی کے غم میں سنگھاسن پہ نہ بیٹھے تھے بھرت
راج گدی پہ کھڑاؤں کو ہی رکھے تھے بھرت

رام کے واسطے رہتے تھے بھرت اتنے اداس
اس اداسی میں نہ پہنا کبھی راجہ کا لباس
کوئی قصہ ہو تو لے آؤ گواہی کے لیے
ایسا بلیدان دیا کس نے ہے بھائی کے لیے

ارملا اور بھرت پر حساس، خیال انگیز اور منفرد نظموں کے علاوہ اس مجموعے میں رامائن کے معروف اور غیر معروف کرداروں مثلاً رام، سیتا، لکشمن، راون، سگریو، اہلیا، کیوٹ، سورپ نکھا، جٹایو، شبری، بالی، جام ونت، پون پتر، تری جٹا، وبھیشن، انگد، مندودری، کمبھ کرن، میگھ ناد اور سشین وغیرہ پر بھی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ رامائن کے تمام کرداروں پر الگ الگ نظمیں اردو میں نہیں لکھی گئی ہیں۔ لہٰذا اس باب میں اولیت کا سہرا شکیل اعظمی کے سر بندھتا ہے۔

شکیل اعظمی کے ساتویں شعری مجموعے کی ابتدا رامائن کے کرداروں اور محل وقوع کے بیان سے ہوتی ہے پھر جنگل اور اس کے متعلقات کا بیان مختلف اصناف مثلاً غزل، نظم اور نظم معریٰ میں کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے پورے مجموعے میں حیرت انگیز طور پر موضوعاتی وحدت کے ساتھ خوشگوار تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے۔ شکیل اعظمی کا تازہ ترین مجموعہ 'بنواس' اردو شاعری کی بندھی ٹکی بند شعریات اور متعین موضوعات سے ایک خوشگوار نقطہ انحراف کی خبر دیتا ہے جس کی تحسین لازمی ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی
5 جولائی 2020 ، صدر شعبہ ترسیل عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

بنواس

درد بنواس میں ہوتا ہے بہت
اپنے لوگوں سے بچھڑ جانے کا
اپنی مٹی سے اُکھڑ جانے کا
اپنے ہی گھر سے اُجڑ جانے کا
دل اکیلے میں بنا بولے ہی
چھپ کے احساس میں روتا ہے بہت
درد بنواس میں ہوتا ہے بہت

نوٹ: ہندوستان ایک سے زیادہ زبانوں اور بھاشاؤں والا قدیم ملک ہے۔ کئی زبانوں کے کتنے ہی الفاظ اُن کے اپنے ہی علاقوں میں اپنی صورتیں اور آوازیں بدلتے رہتے ہیں۔ 'ونواس' ہندی لفظ ہے۔ جب یہ اُردو میں آیا تو 'بن باس' ہو گیا۔ میں بھی اسے اسی شکل میں استعمال کرتا رہا ہوں۔ لیکن اس بار میں نے اردو سے 'بن' اور ہندی سے 'واس' لے کر اسے 'بنواس' بنایا ہے۔ ہیئت کی اس تبدیلی میں ہماری گنگا جمنی تہذیب کا حسن بھی ہے اور صوتی خوبصورتی بھی۔

بھرت

اور پھر یوں ہوا دشرتھ نہ رہے دنیا میں
پھر سے اک بار ہوا راج سنگھاسن خالی
اور پھر لگنے لگی پوری ایودھیا ویران
رام جنگل میں تھے بنواس کے وردان کے ساتھ
سیتا لچھمن بھی تھے جنگل میں شری رام کے ساتھ
شترگھن اور بھرت پہلے سے ننھیال میں تھے
راج سنکٹ میں تھا درباری بڑے حال میں تھے
رانیوں میں تھی الگ جنگ الگ کھیل شروع
راج کے حال پہ چنتت تھے بہت راج گرو
پھر گرو دیو کی بیٹھک میں یہ طے پایا گیا
کیکئی پتروں کو ننھیال سے بلوایا گیا

جب بھرت آئے محل میں تو بہت ٹوٹ گئے
رام، لچھمن کو نہ پائے تو بہت ٹوٹ گئے
ماں کے مانگے ہوئے وردان سے آگھات لگا
اُن کو آج اپنے ہی سمان سے آگھات لگا
ایسا آگھات کہ پھر ٹوٹ کے روئے تھے بھرت
رام کے درد میں اُس رات نہ سوئے تھے بھرت
اور پھر راج تلک کرنے سے انکار کیا
راج گدی کے لئے رام کو حقدار کیا
پھر بھرت گھر سے چلے رام کو لانے کے لیے
دل پہ جو داغ لگا اُس کو مٹانے کے لیے
ساتھ ماؤں نے بھی پھیلایا تھا جنگل کی طرف
پورا کنبہ ہی نکل آیا تھا جنگل کی طرف
رام سے مل کے بھرت نے کہا اب گھر چلئے
ماں کے مانگے ہوئے وردان سے باہر چلئے
ہاتھ جوڑے تھے بھرت نے بڑی منت کی تھی
رام سے لگ کے گلے خوب محبت کی تھی
پھول اک شاخ پہ مہکے تھے وہیں کھل کے بہت
رام بھی روئے تھے بھائی سے گلے مل کے بہت
بھائی سے بھائی کا یہ پیار تھا جنگل میں مثال
پر کہیں رام کے بھیتر تھا وچن کا بھی خیال

لوٹ کر جا نہ سکے من میں ارادہ کر کے
رام مجبور تھے بنواس کا وعدہ کر کے
بات جب بن نہ سکی، پار نہ کشتی لاگی
تو بھرت نے بڑے بھیّا سے کھڑاؤں مانگی
اُس کھڑاؤں کو بھرت سر پہ اُٹھا کر لائے
رام کی یاد کو سینے میں بسا کر لائے
بھائی کے غم میں سنگھاسن پہ نہ بیٹھے تھے بھرت
راج گدی پہ کھڑاؤں کو ہی رکھے تھے بھرت
رام کے واسطے رہتے تھے بھرت اتنے اداس
اس اُداسی میں نہ پہنا کبھی راجہ کا لباس
کوئی قصہ ہو تو لے آؤ گواہی کے لیے
ایسا بلیدان دیا کس نے ہے بھائی کے لیے

اُرمِلا

رام کو جو ملا بنواس غلط تھا لیکن
کوئی راجا کبھی مجبور بھی ہوسکتا ہے
ضد پہ اَڑ جائے جو روٹھی ہوئی سوتیلی ماں
باپ بیٹے سے بہت دور بھی ہوسکتا ہے
یہ جو بنواس تھا یہ کھیل حکومت کا تھا
اور اِس کھیل میں ہر داؤ سیاست کا تھا
ملک جل جاتے ہیں کتنے ہی سیاست کے لیے
قتل ہو جاتے ہیں اپنوں کے حکومت کے لیے
گھر سے جنگل کو چلے رام جو دنیا کو سمیٹ
اُرملا کو بھی چڑھایا گیا بنواس کی بھینٹ
صرف پتنی ہی نہیں خود کو بھی قربان کیا
چھوٹے لچھمن نے بڑے رام پہ احسان کیا

رام راجا بھی تھے، انسان بھی، بھگوان بھی تھے
اُرملا کے وہ مگر بھاؤ سے انجان بھی تھے
روح جنگل میں تھی اور جسم محل کے اندر
وہ بھی رہتے ہوئے پتھر میں ہوئی تھی پتھر
دور رہنا پڑا لچھمن سے اُسے چودہ برس
وہ محل اس کے لیے ایسا تھا جیسے کہ قفس
اُرملا بے دل و بے جان تھی لچھمن کے بغیر
جیسے سنگھار ہو کوئی کسی درپن کے بغیر
درد اس کا کبھی دیوار سے نکلا ہی نہیں
اس میں جو موم تھا وہ دھوپ میں پگھلا ہی نہیں
ایسی خاموشی جو آواز نہ بننے پائی
وہ تھی اک راز جو ہمراز نہ بننے پائی
ایک چنگاری بنا بھڑکے ہوئی راکھ میں راکھ
اس کے اشکوں سے نہ بھیگی کبھی اتہاس کی آنکھ
ایسا کردار کہ جس کا کوئی قصہ بھی نہیں
اُرملا رام کے بنواس کا حصہ بھی نہیں

مریادا پرشوتم

باپ کے ایک وچن کی خاطر
جو محل چھوڑ کے جنگل میں رہے چودہ برس
رام تھے ایسے بیٹے
لاکھ سمجھانے منانے پہ بھی جو راج سنگھاسن تج دے
ایک وردان کی مریادا میں
اپنے بھائی کو وداع کر دے کھڑاؤں دے کر
اور جنگل میں چلے ننگے پاؤں
رام کا دھرم تھا وہ
جس کا اک تیر سمندر کو سکھا سکتا ہو
وہ سمندر پہ کوئی آنچ تک آنے نہ دے
خود ہی تکلیف سہے
اور مہینوں رک کر
پار اترنے کے لیے پل باندھے
رام میں شکتی تھی وہ
رام میں دھیرج تھا وہ
راجا ہوتے ہوئے
سکھ بھوگے نہیں راجا کا

جو سدا دھیان رکھے پرجا کا

رام تھے ایسے راجا

گھر سے پریوار تلک

زندگی کے سبھی چھوٹے بڑے کردار تلک

سب کو اک دھاگے میں موتی سا پرو کر رکھا

پھول کے ساتھ جو دنیا نے انہیں کانٹے دیے

ان کو بھی پیار سے سینے میں سنجو کر رکھا

جانور ہوں

کہ پرندے ہوں

کہ ہو پیڑ کوئی

رام نے سب کو محبت کی نظر سے دیکھا

جیو کی شکل بدلتی رہی جنگل میں مگر

رام نے اپنی طرح سب کو ہی انساں سمجھا

رام ہیں ایک وِچار

رام ہیں ایک خیال

رام ہیں ایک سفر

رام ہیں ایک مثال

آدمیت کی مثال ایسی بہت کم ہوگی

رام کو دل سے جو سوچو تو پلک نم ہوگی

جو ہے پرشوتم انسانوں میں اُس نام کی جے

یاد جب آئیں تو سو بار کرو رام کی جے

اہلیا

رام تم کیوں مجھے چھو کر گزرے
توڑ کر کیوں مجھے پتھر سے نکالا تم نے
مورتی ہی مجھے رہنے دیتے
مورتی ہوتی تو شاید مری پوجا ہوتی
عورتیں دیویاں مر کر ہی بنا کرتی ہیں
زندہ عورت تو فقط روپ ہے
جیسے میں ہوں
زندہ عورت تو فقط جسم ہے
جیسے میں ہوں
مجھ کو اس جسم سے اس روپ سے آزاد کرو
ایسی دنیا میں مری روح کو آباد کرو
جس میں گھوریں نہ کسی اندر کی آنکھیں مجھ کو
جس میں پھر سے کوئی گوتم مجھے شاپت نہ کرے
میری مرضی کے بنا مجھ پہ حکومت نہ کرے
پھر کوئی مرد مجھے دیوی سے عورت نہ کرے

کیوٹ

رام جی آپ مری ناؤ کو اسپرش نہ دیں
آپ کو لے کے میں اس پار نہیں جاؤں گا
ناؤ میں لکڑی ہے، لوہا بھی ہے، پتھر بھی ہے
آپ کے چھونے سے عورت نہ کہیں بن جائے
روزی روٹی کا یہی ایک ہی سادھن ہے مرا
چلتا پھرتا ہوا اک پُل ہے یہی دریا پر
گاؤں سے گاؤں کا اک جوڑ ہے صدیوں سے یہاں
لوگ گھبرائے ہوئے رہتے ہیں ندیوں سے یہاں

یہ ندی جان بہت لیتی ہے برساتوں میں
چین کی نیند کوئی سوتا نہیں راتوں میں
وقت رُک جائے گا یہ جوڑ اگر چھوٹ گیا
لوگ مر جائیں گے یہ پل بھی اگر ٹوٹ گیا
رام پھر رام ہیں تدبیر نکل ہی آئی
رام کی بات نے ملاح کا دل پھیر دیا
اس چمتکار پہ خوش ہو کے بہت جھوما گگن
اور پھر رام کے ملاح نے دھوئے تھے چرن
پھر وہی ناؤ انھیں لے کے چلی موجوں پر
ناؤ اُس پار گئی اور سلامت بھی رہی
پاٹھ مانوتا کا ملاح کو سمجھایا تھا
رام نے اپنے برابر اُسے بیٹھایا تھا

سورپ نکھا

خوبصورتی

عورت کا

ہر بار ساتھ نہیں دیتی

اس خنجر سے

کبھی کبھی

وہ خود ہی کٹ جاتی ہے

لچھمن

بھابھی ماں بھی ہوتی ہے
لیکن پھر بھی
پاؤں سوا کچھ بھی نہ دیکھا سیتا میں
میگھ ناد نے برہماستر جب لچھمن کے اوپر مارا تھا
لچھمن بالکل ڈرے نہیں تھے
جگہ سے اپنی ہٹے نہیں تھے
ہاتھ جوڑ کر لچھمن نے سمان کیا تھا برہماستر کا
تیر نے خود ہی اپنا رستہ کاٹ لیا تھا
اک انسان میں
آدر بھی ہو بل بھی ہو
کرودھ بھی ہو دھیرج بھی ہو
ایسا کم ہی ہوتا ہے
لیکن لچھمن ایسے ہی تھے

لچھمن کیا تھے
رام کا ہی اک حصہ تھے
دونوں مل کر رامائن کا قصہ تھے
کہنے کو تو رام کے چھوٹے بھائی تھے
لیکن سچ میں رام کی وہ پرچھائیں تھے
سیتا کے سوئمبر سے بنواس تلک
رام کی اک اک سانس تلک
لچھمن رام کا سایہ بن کر چلتے تھے
رام کے ہر آرام سے کھانے پینے تک
اچھا اور رسر کشا تک
چھوٹی بڑی ضرورت تک
سب چیزوں کا دھیان رکھا تھا لچھمن نے
لچھمن رام کے سب سے اچھے سیوک تھے
لچھمن رام کے سب سے سچے سیوک تھے

1۔ برہما سے ملا ہتھیار، شکتی

لچھمن ریکھا

کھیل راون کا تھا، ماریچ بنا تھا مہرہ
بھیس اس مہرے کا سونے کے ہرن جیسا تھا
اس کی سُندرتا پہ موہت تھیں بہت سیتا جی
ان کو ہر حال میں سونے کا ہرن چاہیے تھا
رام مجبور ہوئے سیتا کی ضد کے آگے
اور پھر سیتا کو لچھمن کے حوالے کرکے
رام نکلے اُسی سونے کے ہرن کی خاطر
ہاتھ میں تیر لئے اور نشانہ باندھے
دوڑتے بھاگتے سونے کے ہرن کے پیچھے
وہ بہت دور بہت دور نکل آئے تھے
اس میں بھی چال تھی راون کے اُسی مہرے کی
چلتے چلتے مگر اک تیر نشانے پہ لگا
اپنے ہی روپ میں پھر دھرتی پہ ماریچ گرا
رام کے لہجے میں آواز دی 'لچھمن لچھمن'

رام نے بھانپ لیا دال میں کچھ کالا ہے
چھوڑ کر اُس کو وہ کٹیا کی طرف چل نکلے
جب یہ آواز پڑی کانوں میں سیتا جی کے
وہ یہ سمجھیں کہ شری رام مصیبت میں ہیں
اور پھر سیتا نے لچھمن سے کہا 'ہے لچھمن
جاؤ دیکھو ذرا بھیا ہیں کسی سنکٹ میں
چھوڑ کر سیتا کو لچھمن بھلا جاتے کیسے
اپنے بھیا کا وہ آدیش بھُلاتے کیسے
اس لیے جانے سے انکار کیا لچھمن نے
اور انکار کئی بار کیا لچھمن نے
اُن کے انکار کو ڈر مان لیا سیتا نے
کہہ کے کائر بڑا اپمان کیا سیتا نے
اپنی کائرتا کے طعنے کو وہ سہہ بھی لیتے
ضد پہ سیتا کی مگر جانا پڑا لچھمن کو
جاتے جاتے مگر اک رَکشا کی ریکھا کھینچی
مان کی، دھرم کی، مریادا کی ریکھا کھینچی
اور سیتا کو اُسی ریکھا میں رہنے کو کہا
اور پھر ڈھونڈنے بھیا کو اُسی اور بڑھے
جس طرف سے اُنھیں آواز کا اندازہ تھا
چال پھینکی ہوئی راون کی نہ بیکار گئی
لچھمن اُس اور گئے اور اِدھر آیا راون

بھیس بھکشک کا تھا سیتا نہ اُسے جان سکیں
اس کے اندر چھپے راون کو نہ پہچان سکیں
بھیک دینے کے لیے دوار پہ آئیں سیتا
پاس قدموں کے ہی سیتا کے تھی لچھمن ریکھا
سیتا آگے نہ بڑھیں جب تو کہا راون نے
میں ہوں بھکشک مرا اس طرح نہ اپمان کرو
بھیک دینی ہے تو اس ریکھا سے باہر آؤ
پاپ کا، شراپ کا سیتا پہ وہ جھانسہ پھینکا
اک نئی چال چلی، اک نیا پانسہ پھینکا
سیتا گھبرائی ہوئی توڑ کے لچھمن ریکھا
ہاتھ میں بھیک لئے دوار سے باہر نکلیں
لوٹ کر آئے نہیں رام نہ پہنچے لچھمن
لے کے سیتا کو نکل بھاگا وہاں سے راون
زندگی میں ہے بڑے کام کی لچھمن ریکھا
آج بھی ہم کو دکھا دیتی ہے درپن ریکھا

جٹایو

پکارا رام کو 'ہے رام' کہہ کے سیتا نے
تو آسمان تلک پہنچ وئی گونج اٹھی
ہوا کے رتھ پہ تھیں راون کے ساتھ ماتا شری
ابھی ابھی تو ہوا اپہرن تھا منیا کا
جٹایو دوست تھے دشرتھ کے، رام پُتر سمان
بہو کے جیسی تھیں سیتا جٹایو کی خاطر
جٹایو بوڑھے تھے راون تھا شکتی شالی بہت
مگر یہ وقت تھا شعلوں میں کود پڑنے کا
سو پھر جٹایو نے سوچا نہ کچھ وچار کیا
بدن میں جتنی بھی طاقت تھی سب اکٹھا کی
زمیں کو چوما عقیدت سے اور اڑان بھری
پلک جھپکتے ہی راون کے سر پہ جا پہنچے

جٹایو چونچ سے پنجوں سے حملہ کرتے رہے
ذرا سی دیر میں راون لہولہان ہوا
چلا نہ زور تو تلوار کھینچی راون نے
اور ایک پنکھ جٹایو کا اُس نے کاٹ دیا
اب ایک پَر کے سہارے ہی اُڑ رہے تھے وہ
بہت ضروری تھا لڑنا سو لڑ رہے تھے وہ
لڑائی چلتی رہی چلتی رہی چلتی رہی
فضا میں اُبھرا تھا پھر ایک ایسا منظر بھی
بکھر گیا تھا جٹایو کا دوسرا پَر بھی
تمام قدریں امر ہو رہی تھیں بکھرن میں
کوئی فقیر تھا جیسے پروں کی کترن میں
لہو سے اپنے بناتا ہوا وفا کی لکیر
گرا زمیں پہ جٹایو کا چھنن بھنن شریر
زمیں پہ گر کے جٹایو نے مہرباں کی طرف
اُداس آنکھوں سے دیکھا تھا آسماں کی طرف

شبری

اپنے بھگوان کی بھگتی میں سمائی ہوئی تھی
پریم ایسا تھا کہ خود سے بھی پرائی ہوئی تھی
نام شبری تھا مگر نام بھی بسرائی ہوئی تھی
انتظاری تھی کچھ ایسی کہ وہ اِترائی ہوئی تھی
دن گزرتے گئے پر آس نہ ٹوٹی اُس کی
اس کے قدموں سے لگی راہ نہ چھوٹی اُس کی
اپنی پلکوں کو عقیدت سے بچھاتی ہی رہی
رام کے رستے میں وہ پھول سجاتی ہی رہی
رام آئیں گے یہ احساس بہت تھا اُس کو
اپنے بھگوان پہ وشواس بہت تھا اُس کو

دور پربت پہ کہیں کالی گھٹا چھائی تھی
دل میں جو آگ تھی آنکھوں میں اُتر آئی تھی
آنکھ میں شبری کے آنسو جو پگھل کر آئے
رام بھیگے ہوئے بادل سے نکل کر آئے
جس طرح چاند ستاروں میں چلا کرتا ہے
رام یوں بکھرے ہوئے پھولوں پہ چل کر آئے
رام کو پاکے ہوئی ایسی دِوانی شبری
بن گئی دنیا میں اک پریم کہانی شبری
پریم بھی ایسا کہ بہتا ہوا جل ہو جیسے
اور اُس جَل میں کھلا کوئی کنول ہو جیسے
رام کے واسطے شبری نے چنے میٹھے بیر
اور اُن بیروں کو چکھ چکھ کے تسلّی بھی کی
تاکہ ان بیروں میں اک بیر بھی پھیکا نہ رہے
رام تھوڑا سا بھی سنکوچ نہ مَن میں لائے
بیر جو ٹھے تھے مگر خوب مزے سے کھائے
پریم میں، بھکتی میں، مُکتی کا سفر ہونا تھا
رام سے شبری کے رشتے کو امر ہونا تھا

سگریو

رشیہ موک پربت اڈہ تھا بیکاری کا

اس اڈے کی بیکاری میں
چھپی ہوئی تھی اک شکتی

اک ایسی شکتی جس میں

اک پل بھی تھا

اک کھوج بھی تھی

اک جنگ بھی تھی

پل جو سمندر پر بننا تھا

کھوج جو سیتا کی کرنی تھی

جنگ جو راون سے لڑنی تھی

اک مضبوط دوستی کی بنیاد بھی تھی

جو رام سے تھی

رام آئے تو کتنے مقصد لے آئے

اک ایماندار شخص کو اپنے سب کھوئے سمان ملے

مریادا پرشوتم کے

روپ میں اک بھگوان ملے

بالی

چھ مہینے کے بعد بالی نے
خود ہی کھولا گپھا کے پھاٹک کو
اپنے ہونے کا پھر اعلان کیا
راکشس کو لہو میں نہلا کر
کیا پتا کب کوئی واپس آجائے
اس لیے موت کا ماتم نہ کرو

جام ونت

تم ہنومان ہو
تم گیانی ہو
تم سب سے شکتی شالی ہو
اپنی شکتی کو پہچانو
تم کچھ بھی کر سکتے ہو
نگل گئے تھے سورج کو تم بچپن میں
جام ونت نے اک دن یاد دلایا تھا
ہنومان کو اپنے آپ سے ملوایا تھا

پون پُتر

تلاش جاری ہے سیتا کی سب دِشاؤں میں
اشارے جتنے ملے ہیں سبھی ہیں دکھن کے
جدھر زمین پہ پھیلا ہوا سمندر ہے
سمندر ایسا کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں
سمندر ایسا کہ پانی ہے صرف پانی ہے
یہ پانیوں کا سفر کس طرح سے طے ہوگا
لکھن ہوں، رام ہوں، سگریو ہوں کہ انگد ہوں
سبھی وچار میں گم ہیں، سبھی پریشاں ہیں
مگر دماغ میں ہنومان کے کچھ اور ہی ہے

ہوائیں کہتی ہیں آؤ ہمارے ساتھ چلو
ہمارے پاس پتا ہے تمہاری سیتا کا
گھٹائیں کہتی ہیں آؤ ہمارے ساتھ چلو
ہمارے پاس ہے چہرہ تمہاری سیتا کا
وہ تھوڑی دیر کھڑے ہوکے یونہی تکتے ہیں
بگڑتے بنتے ہوئے بادلوں کے چہروں کو
اُنھی میں تھا کوئی اک چہرہ جیسے سیتا کا
ابھی ابھی جو بنا اور بن کے بگڑا تھا
اُس ایک پَل میں ہنومان کو یہ لگتا ہے
کہ جیسے پھوٹ پڑے ہوں بدن میں پَر اُن کے
کہ جیسے اُڑنے کا من ہو رہا ہو اندر سے
وہ آنکھ موند کے دھرتی سے پگ اٹھاتے ہیں
پھر اس کے بعد گھٹاؤں میں خود کو پاتے ہیں
ہوا کے بیٹے سے بادل کلام کرتا ہے
اُٹھا کے ہاتھ سمندر سلام کرتا ہے

اشوک واٹکا

اشوک واٹکا مہکی ہوئی ہے پھولوں سے
کئی درختوں کی شاخوں پہ پھل لدے ہوئے ہیں
فضا میں سُر ہے ملا خوشنما پرندوں کا
چمکتی دھوپ ہے پیڑوں پہ اور پیڑوں تلے
بچھی ہوئی ہے زمینوں پہ چھاؤں کی چادر
اور ایک پیڑ کے نیچے وہیں پہ سیتاجی
اُداس بیٹھی ہوئی ہیں تری جٹا کے ساتھ
تری جٹا اُنھیں سمجھا رہی ہے باتوں سے
اُسی درخت پہ چپ چاپ بیٹھ کر ہنومان
بڑے ہی دھیان سے دونوں کی بات سنتے ہیں
وہیں سے چھپ کے گراتے ہیں ایک انگوٹھی

یہ وہ انگوٹھی ہے جو رام کی نشانی ہے
اسی نشانی میں اک پیار کی کہانی ہے
انگوٹھی دیکھ کے خوش ہو رہی ہیں سیتاجی
انھیں یہ لگتا ہے جیسے یہیں کہیں ہیں رام
حقیقتیں ہیں مگر خواب کے جزیروں میں
کبھی بھرم کبھی وشواس کی لکیروں میں
کبھی یقینی کبھی بے یقینی کی صورت
اُبھرتے مٹتے ہیں چہرے پہ ان کے بھاؤ کئی
پگھلنے لگتے ہیں آنکھوں میں من کے گھاؤ کئی
وہ سارے بھاؤ لئے اپنی آنکھ میں ہنومان
بہت سنبھال کے اُس پیڑ سے اُترتے ہیں
ادب سے کرتے ہیں پرنام سیتا ماتا کو
اور اپنے بارے میں سب کچھ انھیں بتاتے ہیں
بتاتے ہیں کہ شری رام کا میں سیوک ہوں
انھی کی بھکتی میں آیا ہوں آپ کو لینے
مگر نہ لانگھ سکیں سیتا اپنی مریادا
سوال سب سے بڑا خود کے احترام کا تھا
انھیں کسی کا نہیں انتظار رام کا تھا

تری جٹا

وہ راکشسی تھی مگر اس میں آدمیت تھی
کسی کا زخم نہ مہکا تھا اس کے ناخن میں
کسی کی جان نہ نکلی تھی اس کے پنجوں میں
نہ اس کے دانتوں میں ریشے کسی کے گوشت کے تھے
گلے میں اس کے نہ مالا تھی ہڈیوں کی کوئی
خیال رکھا تھا لنکا میں اس نے سیتا کا
بدن میں اس کے بڑی نیک آتما تھی کوئی
کمال یہ ہے کہ سیتا نے ماں کہا تھا اُسے
وہ راکشسی تھی مگر اس میں آدمیت تھی
اسی لئے اُسے انسان سے محبت تھی

وِبھیشن

دھرم کی راہ کٹھن تھی پہلے
دھرم پر چلنے کا مطلب تھا کہ سچے رہیے
عمر بڑھ جائے چاہے جتنی بھی
آپ پوری طرح سچے رہیئے
زندگی جتنی ملی ہے، ساری
بیتنی چاہیے ایمان کے ساتھ
ایسا ہی دھرم تھا وبھیشن کا
وہ جوراون کے چھوٹے بھائی تھے

دھرم کے نام پہ ایمان سبھے
دربدر کر دیا مجرم کی طرح راون نے
جرم یہ تھا کہ وہ آئینہ دکھا دیتے تھے
اور ڈر لگتا تھا راون کو اس آئینے سے
جرم یہ تھا کہ بتاتے تھے وہ سچائی کی راہ
جس پہ چلنا کبھی آیا ہی نہیں راون کو
جرم یہ تھا کہ انھیں رام بھلے لگتے تھے
جرم یہ تھا کہ انھیں سیتا سے ہمدردی تھی
جرم یہ تھا کہ غلط کہتے تھے اپنوں کو وہ
اور انھی اپنوں کے مرنے پہ وہ روتے بھی تھے
موت راون کی ہوئی تھی جس دن
آخری بار وہ تب روئے تھے
دل میں جتنا بھی تھا ان کے آنسو
آخری بار وہ سب روئے تھے

پانی پہ راستہ

رام بیٹھے ہیں سمندر پہ تپسیا کرنے
کچھ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں فقط دھیان میں ہیں
راستہ کوئی نکل آنے کے انومان میں ہیں
سیتا لنکا میں ہیں راون کی نظربندی میں
رام کو جانا ہے اُس پار بہت جلدی میں
تین دن بیت گئے رام کو بنتی کرتے
پر سمندر میں کسی راہ کا درشن نہ ہوا
رام ہیں کرودھ میں آویش میں ایمان کے ساتھ
اب کنارے پہ کھڑے ہیں وہ دھنش بان کے ساتھ
بان ایسا کہ اگر چھوٹے تو پرلے آجائے
جانور، مچھلیاں پانی کے بنا مر جائیں
سوکھ کر ختم ہی ہو جائے سمندر کا وجود
بان چلنے میں نہ چلنے میں سمے تھا جتنا
بس اُسی پل میں سمندر ہوا پرکٹ آخر
جوڑ کر ہاتھ ہوا رام کے آگے حاضر
کیا ہے آدیش کہیں، اس نے کہا 'ہے پربھو

اور پھر دیر سے آنے کی چھما بھی مانگی
التجا کی کہ دھنش بان کو واپس رکھ دیں
آپ کا کام ہو اور مان رہے میرا بھی
بات بگڑی تھی مگر کرودھ میں الجھائی نہیں
التجا اس کی شری رام نے ٹھکرائی نہیں
رام کی بات سنی سن کے سمندر نے کہا
آپ بس لاکے مری پیٹھ پہ پتھر رکھ دیں
راستہ بنتا ہوا خود ہی چلا جائے گا
رام کے حکم پہ ہونے لگا پُل کا نرمان
کام پر لگ گئی سگریو کی وانر سینا
پُل بنایا گیا نل، نیل کی اگوائی میں
یہ چمتکار ہوا پانی کی گہرائی میں
پُل کے نرمان میں دن لگ گئے کافی لیکن
پر سمندر پہ کوئی آنچ نہیں آنے دی
چاہتے رام تو وہ بان چلا سکتے تھے
ایک ہی پل میں سمندر کو سکھا سکتے تھے
رام بھگوان تھے، ایسے ہی نہیں تھے بھگوان
جیو جنتو کو بھی سمجھا تھا انھوں نے انسان
آدمیت سے انھیں پریت بہت زیادہ تھی
جو کیا رام نے وہ رام کی مریادا تھی

لنکادہن

غرور

ہوتا ہے
جنگل کی آگ کے جیسا
اک ایسی آگ

جو دہشت میں ڈال دیتی ہے
مگر غرور ہر اک بار بھول جاتا ہے
کہ آگ کیسی بھی ہو

اس کو راکھ ہونا ہے

انگد

دوت انگد کو بنا کر اک دن
رام نے بھیجا تھا راون کے یہاں
شانتی سے بھری چٹھی لے کر
جس میں لکھا تھا کہ ہم جنگ نہیں چاہتے ہیں
اس ہری دھرتی پہ انسانوں کا
ہم لہو رنگ نہیں چاہتے ہیں
ہم چلے جائیں گے سینا لے کر
صرف سیتا ہمیں واپس کر دو
شانتی کے لیے تیار کہاں تھا راون
اور پھر آگ تھا
شعلہ تھا
دھواں تھا راون

مندودری

کبھی کہا تھا یہ مندودری نے راون سے
میں چاہتی ہوں کہ لنکا میں کوئی یدھ نہ ہو
کسی کی جان نہ جائے کسی کا خون نہ ہو
میں جانتی ہوں بڑی شکتیاں ہیں تم میں مگر
ہوا جو یدھ تو تم یدھ ہار جاؤگے
تمہاری سینا کے اندر بھی یوڈھا ہیں بہت
مگر نہ رام کی سینا سے جیت پاؤگے
مگر غرور اہنکار سے بھرا راون
نہ اپنی رانی کی باتیں سمجھ سکا راون
اسے پتا تھا کہ راون غلط، صحیح ہیں رام
دکھائی دینے لگی تھی اسے دھوئیں کی شام
اُٹھا کے سیتا کو لے آنے کے خلاف تھی وہ
سیاہ لوگوں میں رہ کر بھی کتنی صاف تھی وہ

کمبھ کرن

تم کو کیا ہے
تم سو جاؤ
دور دیس کے سپنے دیکھو
اپنے دیس میں کیا ہوتا ہے
کیا چلتا ہے
تم کو اس سے کیا مطلب
بیماری ہے تو رہنے دو
یُدھ اگر ہے تو ہونے دو
مرتا کون ہے
جیتا کون ہے
تم کو کیا
نیند تمہاری جب ٹوٹے گی
تب اُٹھنا اور لڑ لینا
جب ہم سب مر جائیں گے

میگھناد

اک چڑھتا سورج تھا
جس پر
کالے بادل کا سایہ تھا
اس کی کرنیں
بادل میں سوراخ بنا کر
جہاں جہاں دھرتی پر پڑتیں
دھرتی جل جایا کرتی تھی
پربت ہل جایا کرتے تھے
بڑے بڑے لڑنے والے
اس کی شکتی سے ڈرتے تھے
اک ایسا تیور تھا اس میں
جو بس اس میں ہی دِکھتا تھا
گھمنڈ برا لگتا ہے پھر بھی
اس کے چہرے پر سجتا تھا
لیکن اس کی کچی عمر کا کچاپن
ہر پَل میں کچھ کچا تھا
اچھا تھا کہ وہ بچہ تھا
ورنہ جانے کیا ہوتا

سنکٹ موچن

شکتی ماری گئی ہے لچھمن کو
سانس سینے میں رُک کے چلتی ہے
زخم گہرا ہے اور بڑا بھی ہے
رام بے چین ہیں پریشاں ہیں
کیا کریں کچھ سمجھ میں آتا نہیں
پوری سینا اُداس بیٹھی ہے
پھر وبھیشن انھیں بتاتے ہیں
اپنی لنکا کے راج وید کا نام
رام کا اک اشارہ ہوتا ہے
اور ہنومان اُڑ کے جاتے ہیں
وید کو گھر سمیت لاتے ہیں
جان اٹکی ہوئی ہے لچھمن کی

نبض پر ہاتھ وید رکھتا ہے
اور پھر رام سے یہ کہتا ہے
اک جڑی بوٹی ہے ہمالہ پر
نام سنجیونی ہے بوٹی کا
وہ اگر صبح سے پہلے مل جائے
تو یہ ممکن ہے جان بچ جائے
دوسرا اور کوئی چارہ نہیں
پر یہ سنجیونی ہمالہ سے
رات ہی رات کون لائے گا
بولے ہنومان یہ کھڑے ہوکر
میں جڑی بوٹی لے کے آؤں گا
اس کا حلیہ مجھے بتایا جائے
وید نے رنگ روپ بتلایا
اور بتلایا اُس کے بارے میں
اس میں اک روشنی بھی ہوتی ہے
رات میں جو بہت چمکتی ہے
رام کے آگے سر جھکاتے ہوئے
پہلے ہنومان نے اجازت لی
اور پھر اُڑ چلے ہمالہ کو
اُڑ کے آخر ہمالہ پربت پر
رات ہی میں پہنچ گئے ہنومان

راکشش بھی وہاں تھے راون کے
جن سے ہنومان نے لڑائی کی
اور لڑائی میں مار ڈالا اُنھیں
اور پھر پہنچے اُس جگہ ہنومان
جس جگہ بوٹیوں کا جھرمٹ تھا
صرف سنجیونی نہیں تھی وہاں
اور بھی ملتے جلتے پودے تھے
دیکھ کر اتنی بوٹیاں ہنومان
سوچ میں پڑ گئے ہوئے حیران
جب سمجھ میں نہ اُن کے کچھ آیا
اپنے ساہس سے اپنی شکتی سے
پوری چوٹی اُٹھا لی ہاتھوں میں
اور پھر سے نئی اُڑان بھری
دل میں کچھ تھا تو غم تھا لچھمن کا
اور آنسو بھرے تھے آنکھوں میں
وہ جنھیں پونچھ بھی نہ سکتے تھے
بوجھ جتنا تھا ان پہ پربت کا
رات اس سے زیادہ بھاری تھی
اور یہ یاترا بھی جاری تھی
ذہن پہ ان کے چڑھ رہی تھی رات
صبح کی اور بڑھ رہی تھی رات

اس سے پہلے کہ رات ڈھل جاتی
اس سے پہلے کہ صبح ہو جاتی
لے کے بوٹی پہنچ گئے ہنومان
پھر سے لچھمن میں پڑ گئی تھی جان
اور پھر ٹھیک ہو گئے لچھمن
مٹ گئی رام کی سبھی الجھن
رام کے بھگت ہیں بہت لیکن
پر ہنومان ہیں سنکٹ موچن

سُشین

سُشین نام ہے
لنکا کا راج وید ہوں میں
ذریعہ میں ہی ہوں لچھمن کی جاں بچانے کا
اگر میں چاہتا لچھمن کو زہر دے دیتا
دوا نہ دے کے بھی لچھمن کو مار سکتا تھا
مگر یہ رِیت سدا سے ہے میرے کنبے کی
کوئی ودھرمی ہو
دشمن ہو
یا کُجات کوئی
ہمارا دھرم تو سب کا علاج کرنا ہے
نہ میں نے مارا نہ لچھمن کی جاں بچائی تھی
پرمپرا تھی مری میں نے جو نبھائی تھی

راون

جس نے بلوان کیا راون کو
دیوتاؤں کی تپسیا تھی وہ
اتنی آسانی سے پا جائے برہما کو کوئی
اتنی آسانی سے شو کا کوئی درشن کرلے
ایسا سمبھو ہی نہیں
یہ تپسیا تھی کئی برسوں کی
جس میں دھیرج بھی تھا
بھکتی بھی تھی
شکتی بھی تھی
شکتیاں اتنی بڑھیں راون کی
کوئی ویسا نہ رہا دھرتی پہ شکتی شالی
اس قدر گیان ملا راون کو

دھرم کا
نیتی کا
سنسار کا
ویسا کوئی گیانی نہ رہا
ایسا راجا تھا کہ سونے کی تھی لنکا اس کی
ماتحت اس کے تھے دربار میں جتنے تھے وزیر
ساری سیناؤں سے مضبوط تھی سینا اس کی

راکشس اس کے لیے یدھ لڑا کرتے تھے
وہ کسی سے کبھی ہارا ہی نہیں
شکتی بڑھنے سے اہنکار جنم لیتا ہے
گیان زیادہ ہو تو ہو جاتا ہے گیانی پاگل
ساتھ راون کے بھی ایسا ہی ہوا
اس کی خوبی سے خرابی کے بھی پہلو نکلے
اس کی اچھائی برائی کی وجہ بنتی گئی
ورنہ وہ رام سے لڑتا ہی کیوں
اپنی طاقت پہ اکڑتا ہی کیوں
رانیوں نے اُسے سمجھایا
وزیروں نے کہا
رام سے یدھ نہ چھیڑا جائے
اس لڑائی کی ضرورت ہی نہیں
اُن کی سیتا انھیں واپس کر دو
پر اہنکار میں ڈوبا راون
کسی سمجھوتے پہ تیار نہ تھا
چھیڑ کر یدھ کسی دشمن سے
پیچھے ہٹنا اُسے منظور نہ تھا
اور پھر جنگ ہوئی جنگ ہوئی جنگ ہوئی
جنگ نے خون سے دھرتی پہ گواہی لکھ دی
رام کے تیر نے راون کی تباہی لکھ دی

اگنی پرکشا

میں سیتا ہوں
پتی کے ساتھ میں
بنواس میں رہنا مقدر ہے مرا
کوئی راون مری کٹیا میں بھکشک بن کے آئے
دھوکہ دے مجھ کو
اُٹھالے جائے مجھ کو میری دنیا سے
بچھڑ جاؤں میں اپنوں سے
بچا کر دشمنوں سے
دھرم بھی
مریادا بھی
زندہ رکھوں خود کو
پرائے دیس میں اپنے پتی کا راستہ دیکھوں
کٹے ہر پل مرا صدیوں کے جیسا
مرے دُکھ کو سمجھنے کی کسی کو کیا ضرورت ہے
بھلے میں رام کی پتنی ہوں
لیکن ہوں تو عورت ہی
یہ جو سمّان ہے
اس سے مجھے نیچے اُتارو
مجھے اگنی پرکشا سے گزارو

واپسی

اور پھر ختم ہوئے چودہ برس
اک وچن پورا ہوا
رام کو ایک زمانے کے بعد
ماتر بھومی کا بُلاوا آیا
ان کے سینے میں اُتر آئی ایودھیا پوری
من کی آنکھوں میں کئی خواب جگے گیلے سے
اور پھر پاؤں مچلنے لگے چلنے کے لیے
اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں کی طرف
اک نیا رنگ لئے چہرے پر
رام کٹیا سے ابھی نکلے ہیں
اپنی یادوں کے محل کی جانب
سر جھکائے ہوئے غمگین درخت
چل پڑے رام کے پیچھے پیچھے

راستے لے کے انھیں باہوں میں
ان کی منزل کی طرف بڑھتے ہیں
جانور سارے قطاروں میں کھڑے روتے ہیں
سائبانوں کی طرح سر پہ اُڑا جاتا ہے
دھوپ میں چھاؤں بناتا ہوا چڑیوں کا ہجوم
ندیاں توڑ رہی ہیں ساحل
رام کے پیروں کو چھونے کے لیے
جھرنے گاتے ہیں الوداعی گیت
اور ہواؤں میں ہے غم کا سنگیت
رام جاتے ہوئے خوش بھی ہیں دُکھی بھی ہیں بہت
ان کا جنگل سے جو رشتہ ہے عجب رشتہ ہے
دل میں کچھ ایسا ہے جو ٹوٹ رہا ہے جیسے
ایسا لگتا ہے کہ کچھ چھوٹ رہا ہے جیسے
رام موجود ہیں ہر ذرے میں بن کے احساس
الوداع کہتے ہوئے رام کو جنگل ہے اُداس

والمیکی

وہ ڈاکو تھے
جانے کتنوں کو لوٹا تھا
جانے کتنوں کو مارا تھا
جانے کتنے پاپ کیے تھے
دُکھ پہنچایا تھا کتنوں کو
یہ بھی اُن کو علم نہیں تھا
لیکن ایک رِشی کی بات نے
ایسا اُن کا من پھیرا
لین ہوئے وہ ایک طویل تپسیا میں
مَرا مرا کے جاپ میں ان کے کنٹھ سے پھوٹا رام کا نام
اور ملا پھر آشیرواد برہما کا

اک پریمی پنچھی جوڑے کے ہجر کی آہ
ان کی روح میں کچھ ایسے پیوست ہوئی
ان کے اندر اک شاعر کا جنم ہوا
ایسا شاعر
جو دھرتی کا سب سے پہلا شاعر تھا
جس نے پہلی رامائن کی رچنا کی
سوکھی مٹی کب آنسو سے تر ہو جائے
جنگل میں کب گھر ہو جائے
ڈاکو کب سادھو ہو جائے
کب ایسا جادو ہو جائے
کسی کو بھی معلوم نہیں

علی بابا کلہاڑی مت چلاؤ

علی بابا!
کلہاڑی مت چلاؤ
ابھی بازار میں لکڑی بہت ہے
ابھی مرجینا کی آنکھیں بھری ہیں آنسوؤں سے
ابھی اک لاش کے ٹکڑے
تمہارے گھر میں رکھے ہیں
جنھیں سلوانا ہے تم کو
پھر اس کے بعد چپکے سے
کہیں دفنانا ہے تم کو

علی بابا ذرا ٹھہرو
کلہاڑی مت چلاؤ
تمہارے بھائی کا قاتل
یہ جو چالیس چوروں کا قبیلہ ہے
اگر کچھ دیر کی خاطر
اسے دشمن سمجھنا چھوڑ دو تم
تو یہ جو پیڑ جنگل میں کھڑے ہیں
تمھیں انسان کی صورت لگیں گے
کوئی شاعر
کوئی صوفی
کوئی عالم بھی ہوگا
انھیں میں کوئی اک قاسم بھی ہوگا

مہارانا پرتاپ

اُٹھو رانا!
ابھی لڑنا ہے تم کو
تمھارے زخم گہرے ہیں
مگر تم مر نہیں سکتے
تمھارے جسم سے بہتا ہوا یہ جو لہو ہے راجپوتوں کا
بڑی ہمت ہے اس میں
بڑی طاقت ہے اس میں
تمھارے خون کی گرمی پہ سورج ناز کرتا ہے
ابھی تم مر نہیں سکتے

ابھی تقسیم کرنے ہیں تمھیں تمغے سپاہی کو شہادت کے
تمھارے واسطے جو جنگ کے میدان میں لڑتے ہوئے مارے گئے ہیں
ابھی تو دفن کرنی ہے تمھیں چیتک کی مٹّی بھی
اُٹھو رانا تمھیں میواڑ نے پھر سے پکارا ہے
تمھارے باپ دادا کی ریاست پر
ابھی دشمن کا قبضہ ہے
تمھارے راجا ہونے کے سبھی حق چھن گئے ہیں
مگر تم پھر بھی راجا ہو
یہ رشتے کیسے ٹوٹیں گے جو ہیں مائی سے مائی کے
چکانے ہیں ابھی کچھ قرض تم کو ہلدی گھاٹی کے
بہادر قوم جب تک زندہ رہتی ہے
کبھی ہارا نہیں کرتی
اُٹھا کر جیت کا پرچم
ابھی میواڑ تک بڑھنا ہے تم کو
اُٹھو رانا ابھی لڑنا ہے تم کو

مہاویر سوامی

جانوروں کے پرانوں سے
انسانوں کی جانوں تک
خون سے دھرتی لال ہے
کیسا ہنسا کال ہے
ہنسا چھوڑو
پریم کرو
اک ایسا سنسار بناؤ
جس میں تم بھی چین سے جیو
اوروں کو بھی جینے دو

دنیا میں جتنے ہیں سکھ
جتنے ہیں موہ
سب بیماری کا کارن ہیں
پاؤں کی چپل
پیٹ کا بھوجن
من کی اچھا
تن کا وستر
سب مایا ہے
اسی شریر کو پانے میں
سجانے میں
نبھانے میں
ہم مر جاتے ہیں
جب کہ جیون شریر نہیں ہے آتما ہے
آتما ہی پرماتما ہے

گوتم بدھ

جیون کیا ہے
جیون کیوں ہے
جیون کا بیماری سے کیا رشتہ ہے
بچہ بوڑھا کیوں ہوتا ہے
بوڑھا مر کیوں جاتا ہے
مر جاتا ہے تو پیدا ہی کیوں ہوتا ہے
انسانوں میں اور چیزوں میں کیا انتر ہے
چیزوں کے بننے میں بگڑنا
انسانوں کے جنم میں مرنا
کیوں لکھا ہے
کون ہے ان کو لکھنے والا

آگ ہے کیا
لیکن اس میں بھی تو راکھ ہے
وہ کیسے ہو سکتی ہے

پانی ہے کیا
پانی بھی کیسے ہوگا
دھوپ سکھا دیتی ہے اُس کو
آگ جلا دیتی ہے اُس کو

تو پھر شاید ہوا ہی ہو
ہوا بھی کیسے ہو سکتی ہے
وہ خود کسی کے ہاتھ میں ہے
کبھی ہے پُروا
کبھی ہے پچھوا
دِشا بدلتی رہتی ہے
چلتے چلتے رُک جاتی ہے

تو کیا پتھر ہو سکتا ہے
ہاں پتھر شکتی شالی ہے
لیکن اس کو بھی پربت سے
پھینک رہا ہے کوئی نیچے
پھینکنے والا اس سے بھی شکتی شالی ہے

پیڑ پرندے
کیڑے مکوڑے

سبھی جانور
سبھی انسان
سب کے ساتھ جنم مرن ہے
تو پھر کون ہے
جو نہ جنما جو نہ مرے گا
جو نہ بنا ہے نہ بگڑے گا
اسی کو ڈھونڈو
اسی میں گیان ہے
وہی ہے زندہ
اسی میں جان ہے
پربت سے گرنے والے پتھر کے ٹکڑے
ہاتھوں میں لو اور ٹکراؤ
ٹکرانے سے روشنی ہوگی
اسی روشنی کے رستے پہ
آگے بڑھو
اپنا دیپک آپ بنو

خدا

خدا رہتا ہے پیڑوں میں
خدا پودے اُگاتا ہے
خدا موسم بناتا ہے
خدا ویران شاخوں پر
نئے پتے سجاتا ہے
پھر ان پتوں میں
پتّوں سا
ہوا میں پھڑ پھڑاتا ہے
خدا چڑیوں کے بچوں کی چہک ہے
خدا معصوم پھولوں کی مہک ہے
خدا تتلی کا پَر بھی ہے
درندوں کا قہر[1] بھی ہے
وہ سانپوں کا زہر[2] بھی ہے
پرندے کرتے ہیں تنکے اکٹھا
خدا بُنتا ہے اُن کے واسطے اک آشیانہ
خدا ہے دھوپ جیسا چھاؤں جیسا بادلوں میں
اسے کچھ روز میں نے رہ کے دیکھا جنگلوں میں

۱۔ ۲ : اہلِ زبان سے معذرت کے ساتھ۔ لیکن قوافی کی ضرورت اور تخلیق کی برجستگی کبھی کبھی الفاظ کی روایتی ساخت سے انحراف بھی کرتی ہے۔

کتھا اننتا

بہت بوڑھا ہے یہ جنگل
صدائے کن ہوئی تھی جب
یہ تب بھی تھا
زمیں پر کچھ نہیں تھا جب
یہ تب بھی تھا
بہت بوڑھا ہے یہ جنگل
زمیں کیسے بنی تھی
پہاڑوں سے زمیں کا وزن اور اس کا توازن
کس طرح قائم ہوا تھا
زمیں کی تہہ میں پھیلایا گیا تھا کیسے پانی کو
زمیں کے سر پہ
کیسے اور کتنے آسماں رکھے گئے تھے

پھر ان میں چاند سورج اور ستارے
کس طرح ٹانکے گئے تھے
اسے معلوم ہے سب کچھ
اسے معلوم ہے
کب آئے تھے
کیوں آئے تھے آدم
سبھی پیغمبروں کو
ولیوں کو
پیروں فقیروں کو
پرانے سادھوؤں کو
سنتوں کو
رشیوں کو مُنیوں کو
یہ سب کو جانتا ہے
ہمارے جانے کتنے پرکھوں کے اچھے برے
سب کاموں سے واقف ہے یہ جنگل
بہت قصے ہیں اس کے پاس
جنھیں ہم سن کے زندہ ہیں

آواگمن

بہت پرانی ہے یہ دنیا
جب سے یہ دنیا ہے تب سے
پیڑ بھی ہیں انسان بھی ہیں
پہلے جو انسان یہاں تھے
پیڑوں سے ملتے جلتے تھے
ایک تھے دکھ بھی ایک تھے سُکھ بھی دونوں کے
ایک ہی بھاشا تھی دونوں کی
دل کی بھاشا
جان کی بھاشا
آنسو اور مسکان کی بھاشا
لفظ نہیں تھے اس بھاشا میں
اس بھاشا میں خاموشی تھی
خاموشی میں معنی تھے
بنا لکھے ہی
بنا پڑھے ہی
یہ بھاشا سب کو آتی تھی
جنگل میں بستی رہتی تھی

بستی میں جنگل رہتے تھے
جانے کتنی صدیوں سے اس دھرتی پر انسان آتے ہیں
پیڑ اُگتے ہیں
جانے کتنے انسانوں کی روحیں پیڑ میں رہتی ہیں
جانے کتنے پیڑ ہیں جو انسانوں کے اندر رہتے ہیں
کائنات کا اک چکّر ہے جو صدیوں سے جاری ہے
جانے کتنی صدیوں سے اس چکّر میں
دونوں ساتھ میں چلتے ہیں
دونوں روپ بدلتے ہیں
دونوں جسم بدلتے ہیں
تم بھی کچھ دن رہ کر دیکھو جنگل میں
پیڑ تمھیں اپنے سے لگیں گے
یا تم پیڑ سے ہو جاؤ گے
پھر تم سے بھی پیڑ اُگے گا
جب تم اک دن سو جاؤ گے

جنگل

میں جنگل ہوں
سبھی جانور
سبھی پرندے
ساری گھاسیں
سارے پودے
اونچے نیچے سبھی درخت
سب میرا ہی حصہ ہیں
روزانہ سونے سے پہلے
میں خود کو گنتا رہتا ہوں
ہر گنتی میں تھوڑا تھوڑا کم لگتا ہوں
کٹتا ہوں
زخمی ہوتا ہوں
مرجاتا ہوں
پھر بھی میں زندہ رہتا ہوں

دریا مجھ کو بھیتر بھیتر کاٹ رہا ہے
میں دریا کی موجوں کے اوپر بہتا ہوں
میرے اندر میں ہی صرف نہیں رہتا ہوں
پانی بھی ہے آگ بھی ہے
ہوا کا مجھ میں راگ بھی ہے
ناچوں بھی میں گاؤں بھی میں
چھپ کے اپنے سناٹوں میں
چیخوں بھی چلاؤں بھی میں
روتا بھی ہوں کبھی کبھی میں
میرے اندر درد بھی ہے
رنگ ہرا ہے میرا لیکن
ہرے کے نیچے زرد بھی ہے

جنگل کی دنیا

ہوائیں بہہ رہی ہیں اپنی دُھن میں
پرندے گھونسلوں میں ہیں مزے سے
کوئی تنکا نہیں بکھرا
سبھی انڈے سبھی بچے سرگشت ہیں

درختوں پر
درختوں کے تلے بھی
قطاریں چیونٹیوں کی چل رہی ہیں
گلوں سے تتلیاں لپٹی ہوئی ہیں
سبھی شاخیں سبھی پودے خوشی کے گیت گاتے ہیں
زمیں کا آسماں کے ساتھ رشتہ ہے
ابھی جنگل میں کوئی دیو رہتا ہے

اُتسو

بَن دیوی کے اک مندر میں
پنڈت پیپل نے پوجا کی
اور لگن منڈپ میں آ کر
شادی کے اشلوک پڑھے
دولھا اور دلہن کو باندھا پھیروں میں
جنگل کے بوڑھے برگد نے
آشرواد دیا دونوں کو
دو پیڑوں کی شادی تھی
باراتی پیڑوں نے مل کر برسائے تھے لاکھوں پھول
پورا جنگل مہک رہا تھا
چہک رہا تھا
سورج شاخوں اور پتوں میں
آئینے سا چمک رہا تھا
فطرت اپنا روپ نکالے سنور رہی تھی
ہوا کی ڈولی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی
ایک ہرے کچے ریشم میں بندھے ہوئے تھے دونوں پیڑ
پہلی فصل تھی اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے دونوں پیڑ

ایک پینٹنگ

ایک بڑے سے جنگل میں
بہت سی شاخیں
بہت سے پتے
انھی بہت سی شاخوں اور پتوں کے بیچ
کہیں پہ اک چھوٹی سی تتلی
اُس تتلی کی آنکھ میں بھی
ایک گھنیرا جنگل تھا
قدرت کی اُس پینٹنگ میں
اور بھی جانے کیا کیا تھا

دُعا

درخت جیسے سُلگ رہے ہیں
ہوائیں ساری جھلس گئی ہیں
فضا میں پھیلا ہوا دھواں ہے
سفید بادل کے اُڑتے ٹکڑے
غذائیں سورج کی بن چکے ہیں
گڑھوں میں کیچڑ بھرا ہوا ہے
ندی کا پانی بھی مر گیا ہے
ہر ایک وادی جلی ہوئی ہے
ہر ایک پربت تپا ہوا ہے
بدن پہ سانپوں کے چیونٹیوں کا
ہجوم لپٹا ہوا پڑا ہے
پرندے غائب ہیں گھونسلوں سے
زمیں پہ بیٹھے ہیں جانور یوں
کہ جیسے لاشیں دھری ہوئی ہیں
بس ایک چپ ہے
بس اک خموشی
چلی گئی ہے جو آسماں تک
تمام جنگل میں سوکھے پتے کراہتے ہیں
دعائیں بارش کی مانگتے ہیں

عشق رنگ کا جبّہ پہنے

سا رے گا ما پا دھا نی سا
سا نی دھا پا ما گا رے سا
اُنھی سُروں میں گھلا ہوا تھا بارش میں سنگیت کوئی
پانی کی بھاشا میں لکھا بوند بوند تھا گیت کوئی
بجلی کے مردنگ میں
جل پریوں کا رقص تھا
پانی کے آئینے میں
سو چاندوں کا عکس تھا
بوند بوند اِس گیت کو
پانی کے سنگیت کو
گیلی گیلی آگ میں
میگھ ملہار کے راگ میں
ساون نے کمپوز کیا تھا
پتوں کی سنگت میں گاتا
دل کا کوئی تار بجاتا
عشق رنگ کا جبہ پہنے
ہوا کا جھونکا گھوم رہا تھا
پورا جنگل جھوم رہا تھا

اماوس کی رات

رات کالی بہت ہے
چاند تارے کہیں کھو گئے ہیں
پیڑ پودوں پہ
پتّوں پہ
پھل پھول پہ
رات نے کوئلہ مل دیا ہے
ایک سایہ سا پھرتا ہے چاروں طرف
آبشاروں میں
جھیلوں میں
دریاؤں میں
پانیوں کی جگہ جیسے ڈامر ہو پگھلا ہوا
رنگ برنگے چمکتے پرندوں کے پَر
جیسے ہوں کالی وڈیا کی پرچھائیں میں
ہر طرف جانے کیوں بے اُجالا سا ہے
آج جنگل بہت کالا کالا سا ہے

گھونسلہ

اک چڑیا
کتنے عرصے تک
ایک ایک کرکے
کتنے تنکے چنتی ہے
تب جا کر ایک آدھ گھونسلہ بنتا ہے

تماشہ ہے باقی

پہاڑوں سے گرتا ہوا ایک جھرنا
اُسے ہی پتا ہے
کہ کتنے دنوں سے
گرے جا رہا ہے
بہے جا رہا ہے
یہ جھرنا مسلسل اُدھر بڑھ رہا ہے
جدھر پیڑ چپ چاپ گُم صُم کھڑے ہیں
زمیں کٹ رہی ہے
زمیں پھٹ رہی ہے
جڑیں سارے پیڑوں کی گہرائی تک کھل گئی ہیں
کہ اب لیپ تک ان پہ مٹی کا باقی نہیں
اس قدر دُھل گئی ہیں
بس اک ہونے والا دھماکہ ہے باقی
تماشہ ہے باقی

حوصلہ

اک گھنا پیڑ ہے
جس کے سائے تلے
ایک چھوٹا سا ننھا سا پودا کوئی
آسماں کی طرف سر اُٹھائے ہوئے
پیڑ بننے کی جیسے دُعا کر رہا ہے
اپنے رب سے کوئی اِلتجا کر رہا ہے

سماج

ایک پیڑ سے دوسرا پیڑ
دوسرے پیڑ سے تیسرا پیڑ
جنگل کے سارے ہی پیڑ
سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں
جڑیں، تنے، شاخیں اور پتے
کچھ نہ کچھ سب کا ہے سب میں
اِس کا پھل اُس کی ڈالی پر
اُس کا پھول ہے اُس ٹہنی پر
دھوپ چھاؤں ہوا اور بارش
آپس میں سب کچھ ساجھا ہے
نام الگ ہے نسل الگ ہے
لیکن سب مل کر رہتے ہیں
بڑا پرانا رواج ہے جنگل
محبتوں کا سماج ہے جنگل

جنگل میں شہر

میرے اندر سڑک بنے گی
سڑک کے اوپر برج بنے گا
برج کے اوپر ٹرین چلے گی
چاروں جانب شور مچے گا
ایسے میں پھر کون بچے گا

سفر

میں پہلے پودا بنتا ہوں
میرے موسم مجھ کو پیڑ بناتے ہیں
پیڑ سے میں پھل بنتا ہوں
پھل سے لکڑی بنتا ہوں
لکڑی سے کوئلہ بنتا ہوں
کوئلے سے بنتا ہوں راکھ
راکھ میں بھی زندہ رہتی ہے
میری گیلی گیلی آنکھ

پُنرجنم

ٹہنی سے جو پھول زمیں پر گرتے ہیں
شاخوں سے جو سوکھے پتے جھڑتے ہیں
پودے جو مرجھا جاتے ہیں
پیڑ، جو گر کر بس لکڑی ہو جاتے ہیں
جتنے پنچھی اور جانور مرتے ہیں
دھیرے دھیرے بے چہرہ ہو جاتے ہیں
دھوپ، ہوا، پانی کھاتے ہیں
سڑتے ہیں
گلتے ہیں
کھادیں بنتے ہیں
کھادیں بن کر مٹی میں مل جاتے ہیں
ایک نیا جنگل بن کر کھل جاتے ہیں

گدھ

اس کے چھوٹے پیٹ کے اندر
بڑا سا اک شمشان ہے
آدھے پیٹ کے گیٹ کے اوپر
لکھا قبرستان ہے
جنگل میں مرنے والے
سارے جانور
بنا کسی پنڈت مُلّا کے
بنا کسی اَنتم کریا کے
یہیں پہ جلتے
یہیں پہ دفنائے جاتے ہیں

ردِ عمل

جنگل میں
اک شیر مرا ہے
جانے کس نے مارا ہوگا
لیکن اس کے مرنے سے
پورا جنگل دہشت میں ہے

بہتی ندی کا پانی میٹھا بہت ہے لیکن
اِس پار ہے درندہ اُس پار ہے درندہ

توازن

جنگل میں
گر زوروں کی آندھی نہ آئے
پھل نہ ٹوٹے
تو اپنے ہی پھلوں کے بوجھ سے
ساری شاخیں ٹوٹ پڑیں
پیڑ پرانے
دھرتی سے گر نہ اُکھڑیں
تو ننھے پودوں کا دم ہی گھٹ جائے
ان کو اوپر جانے کا رستہ نہ ملے
گر پیڑوں سے نیچے گر کر
پنچھی کے انڈے نہ ٹوٹیں
تو جنگل میں پنچھی ہی پنچھی ہو جائیں
اگر جانور
اک دوجے کو نہ ماریں
تو جنگل کی آبادی
بستی کے اندر آجائے
انسانوں کو کھا جائے

تعلق

موسم چاہے مجھ کو بدلے
یا میں بدلوں موسم کو
موسم کی ہر تبدیلی سے
متاثر میں ہی ہوتا ہوں

سردی
گرمی
بارش
آندھی
سب مجھ کو سہنا پڑتا ہے
پت جھڑ میں تو بن کپڑوں کے
دھوپ میں رہنا پڑتا ہے
آسمان کی چھت کو چھوتی
جیتی مرتی بیل ہوں میں
ہر موسم کا کھیل ہوں میں

جنگل کا دکھ

آج بہت غمگین ہے جنگل
آج سڑک پر پیڑ گرا ہے
اور پیڑ کے نیچے دب کر
اک انسان کی موت ہوئی ہے

جنگل کو اندر آنے دو

چڑیوں کی چہکار کسی کی بیزاری کا کارن ہو
ایسا کیسے ہوسکتا ہے
پسند نہ آئے ناچ مور کا
خرگوشوں کی اُچھل کود سے وحشت ہو
کسی ہرن کی آنکھ دیکھ کے
محبوبہ کی یاد نہ آئے
ایسا کیسے ہوسکتا ہے
گر سچ مچ ایسا ہی ہے تو
تم بیمار ہو اندر سے
کھڑکی کھول کے باہر جھانکو
سیڑھی سے نیچے اُترو
دروازہ کھولو
جنگل کو اندر آنے دو

پیڑ

پتوں کو کیڑے کھاتے ہیں
پنچھی پھل کھا جاتے ہیں
شکار سے لوٹے تھکے جانور
سائے میں سستاتے ہیں
لکڑی کام آجاتی ہے انسانوں کے
پیڑ کا کوئی ہو یا نہ ہو
پیڑ تو سب کا ہوتا ہے

جنگل کی صبح

فضا میں بھاپ سی پھیلی ہوئی ہے
زمیں سن باتھ لے کر کھل رہی ہے
فلک سے جھانکتا سورج
بہت باریک کرنوں سے
درختوں کی دراریں بھر رہا ہے
ہرے پتے سنہرے ہو گئے ہیں
کہیں جانے کی تیاری میں جنگل سج رہا ہے
پرندوں کا الارم بج رہا ہے

جنگل کی دوپہر

پرندے
شاخوں پر
یا گھونسلوں میں
پروں میں منھ چھپائے اونگھتے ہیں
کہیں پہ اکا دکا جانور کچھ
زمیں پر بیٹھے بیٹھے ہانپتے ہیں
نہ سوکھے پتوں کی ہے چرمراہٹ
نہ ہوتی ہے کوئی رستے پہ آہٹ
صبح سے چلتے چلتے تھک تھکا کر
ہوائیں پیڑوں پر سستا رہی ہیں
نہ کوئی آرہا ہے
نہ کوئی جا رہا ہے
بس اک سناٹا ہے جو چھا رہا ہے

جنگل کی شام

اک سندور کی ڈبیہ سا
سورج ابھی گرا تھا کھل کے جنگل پر
لیکن ابھی ابھی سیاہی بھی
پھیل گئی ہے پیڑوں پر
جنگل کے گوشے گوشے میں
اُتر رہی ہے تاریکی
سارے پنچھی
سارے جانور
لوٹ رہے ہیں جلدی جلدی
اپنے اپنے گھر کی جانب
ایک عجب سا رہسیہ ہے جو
دھیرے دھیرے اپنے پاؤں پسار رہا ہے
جنگل کی تاریکی پل میں
گھنی رات میں ضم ہوتی ہے
عمر شام کی کم ہوتی ہے

رات کی پرچھائیوں کا تانڈو

رات کے سوئے پہروں میں
بستی میں جب سناٹا گہراتا ہے
جنگل میں اودھم ہوتا ہے
پیڑوں پر چہرے اُگتے ہیں
پاؤں نکل آتے ہیں پیڑوں اور پودوں کے
شاخیں ساری دھیرے دھیرے بن جاتی ہیں جیسے ہاتھ
لمبی لمبی جیبھ کے جیسے پتے ہو جاتے ہیں لال
پیڑ اُکھڑ کر مٹی سے جنگل میں چلنے لگتے ہیں
سارے پیڑ بدل جاتے ہیں بھوتوں اور چڑیلوں میں
پُنیہ کی اچھا پاپ کی اچھا
دھن کی اچھا پریم کی اچھا
اچھاؤں کا بھوگ لیے
تن من میں سمبھوگ لیے
اک سُندر سنجوگ لیے
جانے کتنے بچی موتیں مرے ہوئے زندہ ہوتے ہیں
یگوں یگوں کی پیاسی روحیں
تنہائی کو محفل کرنے
اپنے خالی پن کو بھرنے
اک دوجے کے آدھے پن سے

خود کو پورا کرنے کی خواہش کا جشن مناتی ہیں
کہیں پہ مقتل سجتا ہے
کہیں پہ مجرا ہوتا ہے
کہیں کسی جھرنے کے نیچے
دو پریمی گانا گاتے ہیں
کٹے ہوئے انسانوں کے پکوانوں کی دیگیں چڑھتی ہیں
یہاں پہ اُتسو
وہاں پہ جلسہ
آگ، دھواں، وحشت کا رقص
لمبے چوڑے بھاری بھرکم شیطانوں کے بکھرے عکس
طرح طرح کی بھاشائیں
طرح طرح کی آوازیں
فضا میں اک دوجے سے مل کر گتھم گتھا ہوتی ہیں
کبھی تڑکنے لگتی ہیں
کبھی بھڑکنے لگتی ہیں
کبھی قہقہہ مار کے ہنستی
کبھی چیخنے لگتی ہیں
سسک سسک کر بے ہنگم سا شور مچانے لگتی ہیں
پیڑ سہم کر دھرتی میں گڑ جاتے ہیں
پتے پھر سے جیبھ سے پتے بن جاتے ہیں
شاخیں پھر سے ہاتھ سے شاخیں بن جاتی ہیں
پورا جنگل آوازوں کی پرچھائیں سے بھر جاتا ہے
کونا کونا کالے خوف کی دہشت سے ڈر جاتا ہے

جگنو

ستارے
نکلے تھے
کل رات
جنگل کے بدن پر
زمیں کو
آسماں ہوتے ہوئے
دیکھا تھا میں نے

ببول

کون کرے یارانہ اس سے
جس کی جڑ سے پھنگی تک
کانٹا ہی کانٹا رہتا ہے
نہ تو کام کا پھل ہے جس کا
نہ مطلب کے پتّے ہیں
گول مٹول چونی جتنے
نہیں چونی سے بھی چھوٹے
اوپر اوپر کھلتے ہیں
سورج جیسے پیلے پھول
بارہ آنے کی خوشبو
ہوا کے پلّو سے کھل کر
کانٹوں پہ چھٹ جاتی ہے
دھوپ بھی اس کی چھاؤں میں آکے
پوری طرح کٹ پٹ جاتی ہے

بیر

اوپر ڈالی
نیچے سایہ
سائے میں شبری کی چھایا
اس چھایا میں رام کھڑے ہیں
پاس ہی جوٹھے بیر پڑے ہیں

کدم

پھر ہوا کدم سے کہتی ہے
میں اس لیے دھیرے چلتی ہوں
ترا پتّہ کوئی بکھرے نہ
کوئی پھل ٹہنی سے ٹوٹے نہ
اُس دن میں تجھے جھلاؤں گی
جس دن آئیں گے ماکھن چور
باجے گی بنسی کانھا کی
اور جنگل میں ناچے گا مور
تو کیا جانے انجان کدم
میں خود سے ہوئی پرائی ہوں
تو مجھ کو ہوا سمجھتی ہے
میں رادھا کی پرچھائیں ہوں

دیودار

دیودار کے پودے کو
پاروتی نے ایسے پالا
جیسے ان کا بچہ ہو
جڑ میں ایسے پانی ڈالا
جیسے دودھ پلایا ہو
بچے ہوئے پانی سے ایسے
پتوں اور شاخوں کو دھویا
جیسے نہلایا ہو اپنے بچے کو
ماں کی ممتا
انسانوں اور پیڑوں کے
سارے فرق مٹا دیتی ہے
غور سے دیکھو
پیڑوں میں بھی جاں ہوتی ہے
دل ہوتا ہے
لیکن تم کیسے دیکھو گے
ماں ہونا مشکل ہوتا ہے

مہوا

کھیتوں میں
گیہوں کی بالیں
سوکھ کے کھن کھن بجتی ہیں
آندھی آنے والی ہے
بارش آنے والی ہے
مہوے کے گچھوں سے شب بھر
پکا ہوا مہوا ٹپکا ہے
صبح سویرے
پیڑ کے نیچے
لاکھوں موتی بکھرے ہیں
سورج فوٹو کھینچ رہا ہے

آم

بورائے آموں کی خوشبو
فضا میں مدرا گھول رہی ہے
ہوا نشے میں ڈول رہی ہے
کچھ موسم بھی رندانہ ہے
پورا جنگل میخانہ ہے

جامن

کالی کالی جشن کے
نین چھپے ہیں پتوں میں
دور دیس کا اک راہی
ڈال پکڑ کر لٹکا ہے
اُن نینوں میں اٹکا ہے
رستہ بھولا بھٹکا ہے

اِملی

بن کھائے ہی
دانت کے نیچے
دبی ہوئی ہے کھٹاس کوئی
کھٹاس میں ہے مٹھاس کوئی
منہ میں پانی بھرا ہوا ہے

برگد

بہت پرانا رِشی ہے کوئی
کسی تپسیا میں ایسا کھویا
کہ پورا لکڑی کا ہو گیا ہے
شریر لکڑی ہے
پران لکڑی ہے
دھیان لکڑی ہے
گیان لکڑی ہے
ہزاروں سالوں سے بیٹھا بیٹھا
وہ ایک آسن میں جم گیا ہے
سمے ہے کوئی جو تھم گیا ہے

پیپل

گاؤں کی سرحد پر بیٹھا
نبے سال کا اک بوڑھا
سب کے لیے دعا کرتا ہے
جو بچے پردیس گئے ہیں
ان کا رستہ تکتا ہے

تاثر

بچپن سے ہی بھاگ رہا ہے جان بچا کر
ایک آدمی مونچھوں والا
ہنڈیا اور گنڈاسا لے کر
چڑھا ہوا ہے گردن پر
جگہ جگہ سے کاٹ رہا ہے
چھیل رہا ہے
چھانٹ رہا ہے
زخمی کر کے اُسے رُلایا جاتا ہے
بوند بوند ہنڈیا میں ٹپکایا جاتا ہے
اُس کے آنسو دریا بھی ہیں قطرا بھی ہیں
امرت بھی ہیں مدرا بھی ہیں

پاکڑ

مئی جون کی دوپہری میں
اس کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں
سستانے کو جی کرتا ہے
ہرے ہرے پتّوں پہ اس کے
مر جانے کو جی کرتا ہے
ننھے منّے رنگ برنگے
پنچھی آتے جاتے ہیں
بڑے مٹر کے دانے جیسے
پکے ہوئے پھل کھاتے ہیں
قدرت کے گُن گاتے ہیں

گولر

پھول بنا ہی پھل آتا ہے
جانے پھول کہاں جاتا ہے
گولر کے اندر رہوتی ہے
چمکیلے پنکھوں والی
اک چھوٹی سی چڑیا بھی
جب بھی گولر کھانے جاؤ
پھول چُرا کر اُڑ جاتی ہے

نیم

جل جائے یا کٹ جائے
موچ پڑے سوجن آجائے
پھوڑا ہو یا پھنسی ہو
چیچک ہو یا کھجلی ہو
چاہے پیٹ میں کیڑا ہو
یا کوئی بھی پیڑا ہو
یہ جو کڑوا نیم ہے
یہی تو سب کا حکیم ہے

بانس

مٹی کے باہر آتے ہی
آسمان کا رُخ کرتے ہیں
ایک ساتھ کئی ہوتے ہیں
مل کر اوپر جاتے ہیں
دھیرے دھیرے آس پاس کی
دھرتی پر قبضہ کرتے ہیں
اپنا کنبہ پھیلاتے ہیں
گرمی کی دو پہری میں
تیز ہوا کی سنگت میں
اپنے ہی پُرکھوں کا لکھا
کوئی گانا گاتے ہیں
بانسوں کے جھرمٹ میں اکثر
سانپ بھی چھپ کر رہتے ہیں
بطخ پھر بھی بنسواری میں
انڈا دینے جاتی ہے

شیشم

جانے کتنے سال سے ہے
جانے کتنا اور جیے گا
یہ معلوم ہے اس کو ہی
اس کو موت نہیں آتی
جینے سے گھبرا جائے تو
مر جاتا ہے
وہ بھی اپنی مرضی سے

فطرت

شیر انسان ہوتے اگر
کل کی خوراک کے پھیر میں
مارے جاتے سبھی جانور
یا انھیں گھیر کر
لایا جاتا کہیں
اک بڑے سے علاقے کو
باڑہ بنا کر
وہیں رکھا جاتا انھیں
اور پھر
باری باری سبھی
مارے جاتے
غذا بنتے شیروں کے پریوار کی

وہ درندے جو بیچارے کمزور ہیں

ماساہاری تو ہیں

پر شکاری نہیں

ان کو جنگل میں کھانا ہی ملتا نہیں

یا تو مر جاتے

یا بھوک اپنی مٹانے

نکل پڑتے شہروں میں

دیہات میں

کتنا اچھا ہے شیروں میں لالچ نہیں آدمی کی طرح

حملہ کرتے ہیں تب

بھوک لگتی ہے جب

بھینس ہو یا ہرن

وہ کبھی بھوک سے زیادہ کھاتے نہیں

کچھ بھی رکھتے نہیں

بانٹ دیتے ہیں سب

ان درندوں میں جو

ماساہاری تو ہیں

پر شکاری نہیں

جنگل میں ڈیموکریسی

شیروں نے اعلان کیا ہے
اب جنگل آزاد رہے گا
اب نہ کوئی ویرانی ہوگی
اب نہ کوئی برباد رہے گا
جنگل میں جتنے پرانی ہیں
سب جنگل کے مالک ہوں گے
جنگل جتنا شیر کا ہوگا
اتنا ہوگا چیونٹی کا بھی
اب نہ کوئی بھی راجا ہوگا
اور نہ ہوگا پرجا کوئی
لوک تنتر ملکوں کے جیسے
ہوں گے الیکشن اب جنگل میں
سب کا ووٹر کارڈ بنے گا
جو جیتے گا راج کرے گا
ایک نیا قانون بنے گا
جو سب پر ہی لاگو ہوگا
شیروں کے اعلان کے اندر

چیتوں کی مرضی ہے شامل
تیندووں کی منظوری بھی ہے
لکڑبگھوں کا غول ہے پیچھے
اور بھیڑیوں کا جتھا بھی
گدھوں کی بھی اور چیلوں کی بھی
شیروں سے اچھی جمتی ہے
اک بوسیدہ سی چٹان پہ
شاہینوں کے بچے اپنے
پرکھوں کے سب جھوٹے سچے
قصے دہراتے بیٹھے ہیں
ہاتھی پوری مضبوطی سے
کھڑے ہیں سب اپنے پیروں پہ
چنتا ہے نہ آج کی ان کو
اور نہ کل کی پروا کوئی
اسی لیے وہ خاموشی سے
نیا تماشہ دیکھ رہے ہیں
گینڈے بھی ہاتھی کے جیسے
واقف ہیں اپنی طاقت سے
وہ اپنے فارم ہاؤس پر ہیں
پھر بھی حصہ ہیں کھیلوں کا
ادھر سیاروں لومڑیوں نے

مل کر کوئی وِچار کیا ہے
اپنے مطلب کے چکّر میں
سب نے جھوٹا پیار کیا ہے
نیولوں نے بھی موبائل پہ
سانپوں کو لَو یو بھیجا ہے
جھُنڈ بنا کے سب چڑیوں کا
پیڑوں پیڑوں گھوم رہا ہے
اپنے پنچھی سماج کے اندر
لگا ہوا ہے اک کوّا بھی
کوّے کو کوئل بہنوں نے
آج نئی راکھی باندھی ہے
چوہے اپنی بلوں کے باہر
کھلی ہوا میں رپٹ رہے ہیں
خرگوشوں پر جھپٹ رہے ہیں
بھینسیں اپنا کُنْبہ سنبھالے
بہتے دریا میں بیٹھی ہیں
سُور اک گندے جوہڑ میں
دھینگا مشتی مچا رہے ہیں
عادت سے مجبور بچارے
آج بھی کتّے بھونک رہے ہیں
ایک دوسرے کے رستے کو

خود ہی لڑ کر روک رہے ہیں
اک سادھو کی چلم چرا کر
بھالو گانجا پھونک رہے ہیں
امرودوں کے پیڑ پہ چڑھ کر
بندر کرکٹ کھیل رہے ہیں
ایک گلہری اک گوریا
اک دوجے کو چھیڑ رہی ہیں
نئے جہاز کے وگیا پن کی
اک شوٹنگ کی تیاری میں
ژراف کی پوری ٹیم لگی ہے
ہرن کے بچے بے فکری میں
اسکولوں سے لوٹ رہے ہیں
شام ہوئی ہے طوطا مینا
شہر سے ڈی جے لے آئے ہیں
سارے جانور سبھی پرندے
ناچ رہے ہیں جھوم رہے ہیں
آزادی سے گھوم رہے ہیں
جنگل میں سب ٹھیک ٹھاک ہے
پر شیروں کو بھوک لگی ہے

نئے موسم کا جشن

آندھیاں پہلے بھی آتی تھیں چلی جاتی تھیں
گھونسلے کتنے پرندوں کے بکھر جاتے تھے
ٹوٹ جاتی تھیں درختوں کی ہزاروں شاخیں
اور کئی پیڑ تو جڑ سے ہی اُکھڑ جاتے تھے
جانور مرتے تھے مر جاتے تھے پنچھی کتنے
کچھ دنوں رہتا تھا جنگل میں بڑا ہنگامہ
پھر ہوا آتی تھی برسات کا موسم لے کر
بارشیں آندھی کے سب داغ مٹا دیتی تھیں
ندیوں نالوں میں ٹوٹے ہوئے پھل بہتے تھے

کوکھ دھرتی کی اُگا دیتی تھی لاکھوں پودے
پھر یہی پودے بڑے ہو کے شجر بنتے تھے
پھر سے گاتے تھے سبھی پیڑ خوشی کے نغمے
ٹوٹے پیڑوں پہ نئی شاخیں نکل آتی تھیں
خاک تو خاک ہے پتھر پہ بھی آتی تھی بہار
جشن پھر ہوتا تھا جنگل میں نئے موسم کا
لیکن اس بار کچھ ایسی ہے بلا جنگل میں
جس کا کچھ توڑ نہ ہے کوئی دوا جنگل میں
کام کچھ کرتی نہیں کوئی دعا اُس کے خلاف
طے بھلا کون کرے کوئی سزا اُس کے خلاف
اُس کا قبضہ ہے ہواؤں پہ بھی برسات پہ بھی
اُس کا پہرہ ہے بدلتے ہوئے دن رات پہ بھی
پھول پہ، تتلی پہ، چڑیوں پہ بھی پابندی ہے
پورے جنگل پہ عجب چھائی ہوئی زردی ہے
حکم ہے پیڑوں کو اب لکھیں قصیدے اُس کے
جانور اُس کے ہی کاموں پہ مقرر ہیں سبھی
اُس کا مظلوم ہے محکوم ہے سارا جنگل
بولتا کچھ بھی نہیں خوف کا مارا جنگل

جنگل کا آرکسٹرا

شام ڈھلی برگد مہاراج
گود میں لے کے تان پُرا
چھیڑ رہے ہیں من کے تار
پاس میں ہی پنڈت پیپل
ہارمونیم پر بیٹھے
سُروں میں ہیں اپنے الجھے
جمے ہوئے ہیں طبلے پر
بڑے لکڑ بگھا استاد
تھاپ پکھاوج پر دیتے
جھوم رہے ہیں بھالو خان
سارنگی میں ڈوبے ہیں
موند کے آنکھ سیار گرو
بھول کے اپنے پاؤں کا دکھ
چھیڑ رہا ہے مور ستار

مَینا اور بُلبُل کی بھی
لَے اُبھری ہے پیار بھری
کہیں پپیہا پہو پہو
کہیں ہے کوئل کوہوٗ کوہوٗ
زخمی چیتا پنجوں سے
بجا رہا ہے کہیں گٹار
جانے کیسا جنوں ہے یہ
جانے کیسی دُھن ہے سوار
دوڑ بھاگ سے تیندوؤں کی
اُبھر رہی ہے کتھک پڑھنت
ترکٹ ترکٹ ترکٹ دھا
تک دِھن تک دِھن تک دِھن دھا
بندر بھالو کھلے ہوئے
اک دوجے سے ملے ہوئے
ڈول رہے ہیں ٹھُمک ٹھُمک
گھنگھرو بولے جھُنک جھُنک
پہن کے پائل پیروں میں
ہرنوں نے بھی بھری قُلانچ
کارپیٹ پہ گھاسوں کے
جاری ہے فطرت کا ناچ
کانگو بانگو لیے ہوئے

ہیں ننھے منے خرگوش
گلے میں چیلو لٹکا کر
گھوم رہے ہیں کئی ژراف
سونڈ اُٹھا کر ہاتھی بھی
بجا رہے ہیں سیکسو فون
پتہ پتہ عشق میں ہے
پورا جنگل ہے راک اون
ٹوٹ کے اونچے پربت سے
گرتے ہیں پتھر ایسے
جیسے بجے نگاڑے ہوں
جیسے شیر دہاڑے ہوں
شیروں کی غراہٹ میں
گونج رہا ہے کہیں ڈرم
بھونک بھونک کر کتے بھی
بجا رہے ہیں کب سے ڈف
چیہا، کلہٹی، گوریا
کھنجری مادل لیے ہوئے
ردّم کے پیچھے ہوں جیسے
سُروں کے پیچھے ہوں جیسے
چڑیوں کی چہکاروں میں
بانسریوں کی بولی ہے

سُر منڈل کی بھاشا ہے
پیانو کی آوازیں ہیں
بل کھاتے گرتے جھرنے
دریا کے چنچل دھارے
جنگل کی موسیقی میں
گھول رہے ہیں میلوڈی
تانیں بھی ہیں سرگم بھی
سُر کومل ہے مدھم بھی
ہارمنی ہے ہمنگ بھی ہے
پانی میں سنگنگ بھی ہے
دھیرے دھیرے چلی ہوا
وائیلن سی بجی ہوا
محبوبہ کی زلفوں سی
مہکی مہکی کھلی ہوا
بنسواری میں کھڑک اُٹھے
پھر کھڑتال مجیروں سے
سبھی جانور سبھی درخت
صوفی سنت فقیروں سے
جیسے تُمبا کہیں بجے
زمیں پہ ٹپکے ایسے آم
اَلکھ نرنجن، اللہ ھوٗ
کہیں ہے مولا کہیں ہے رام

بانسوں کی رگڑن کا تاؤ
آموں کی ٹوٹن کا گھاؤ
مینا اور بُلبُل کی آس
کوئل کی برسوں کی پیاس
شیروں کے غصے کا رنگ
پتھر سے پتھر کی جنگ
پیڑوں کے اندر کا غم
ہاتھی کا رہنا برہم
چڑیوں کے یہ من کی آگ
ہوا کا ہے یہ بھیگا راگ

آنسو سے لکھا گیت ہے یہ
دل سے نکلا سنگیت ہے یہ
سنگیت میں سات سمندر ہے
جنگل بھی کیا کمپوزر ہے

بنواسی

جنگل ہی آکاش ہے اُن کا
جنگل ہی ان کی دھرتی ہے
جنگل گھر ہے
جنگل ماں ہے
اس جنگل میں سبھی نیم قانون ہیں اُن کے
راجائیں وہ جنگل کے
دوست اگر ہو جائیں تو
دوست کی خاطر مر جائیں
دشمن ہوں تو تیر چلا دیں سینے پر

کل کا بوجھ نہیں رکھتے ہیں سر پر وہ
سر میں اُن کے دُھن ہوتی ہے
اپنی دُھن میں جیتے ہیں
ان کا جیون ایک گلا ہے
گنزوت نہیں آتی ہے اُن کو
میوے اور مسالے سے وہ نمک بدل کرلاتے ہیں
مچھلی مار کے
چاول کھا کے
ہنڑیا[1] پی کے
آگ جلا کے
ہوا کے سُر میں گاتے ہیں
آج کا جشن مناتے ہیں

---

[1] چاول کی شراب

سانسوں کا وشواس

میں جنگل ہوں
پانی بھی ہوں
زمین بھی ہوں
اور خدا کے ہونے کا میں یقین بھی ہوں
تم مجھ کو لکڑی کی خاطر مت کاٹو
میری جڑوں کے اندر کوئلہ مت ڈھونڈو
سونا چاندی
پیتل تانبا
لوہا لکڑ
پتھر وتھر
جو کچھ بھی میرے اندر ہے
سب مٹّی ہے
مٹّی کے چکر میں مٹّی مت کھودو
میری بربادی میں موت ہے دنیا کی
میں جیسا ہوں ویسا ہی رہنے دو مجھ کو
جب تک میں ہوں
تب تک تم ہو
تم میں زندہ ہونے کا احساس ہوں میں
آتی جاتی سانسوں کا وشواس ہوں میں

پیڑ کبھی نہیں مرتا ہے

گھر میں جو فرنیچر ہے
اس کو دھوپ، ہوا، پانی سے
دور رکھو
کرسی میز میں
الماری میں
جانے کب پتے آجائیں
لکڑی اور مٹی میں پھر سے
جڑ کا کب رشتہ ہو جائے
کسی کو بھی معلوم نہیں
جیسے بار فلموں میں
آتمائیں بھٹکتی ہیں
ویسے ہی موسم میں چھپ کے
پیڑوں کی روحیں رہتی ہیں
اوپر سے کالا کر دو یا پیلا کر دو
اندر پیڑ ہرا رہتا ہے
پیڑ کبھی نہیں مرتا ہے

میں ہوں انسان تو ہونے کا پتا دے جنگل
رام جیسے تھے مجھے ویسا بنا دے جنگل

پھر مرے لوگوں نے بنواس دیا ہے مجھ کو
پھر مجھے گھر سے بچھڑنے کی سزا دے جنگل

بیر بھی شبری کے جوٹھے مرے حصے میں نہیں
میں بہت بھوکا ہوں کچھ مجھ کو کھلا دے جنگل

اب کے بنواس میں سیتا ہیں نہ لچھمن مرے ساتھ
جتنے الزام ہیں سب مجھ پہ لگا دے جنگل

میں ہی راون بھی ہوں، ہنومان کی سینا بھی میں
میں ہی گھائل ہوں مجھے کوئی دوا دے جنگل

بالمیکی بنے کوئی مرے لَو کُش کے لیے
میرے بچوں کو بھی جینے کی ادا دے جنگل

میں ہوں ویران بہت شہر کی آبادی میں
اپنے جنگل میں مجھے تھوڑی جگہ دے جنگل

تجھ میں رہتا ہوں تو تجھ سا ہی نظر بھی آؤں
اپنے پتوں سے مرا جسم سجا دے جنگل

اپنے مہوے کی مہک کو مرے نتھنوں سے گزار
اپنی پُروائی کا مجھ کو بھی نشہ دے جنگل

مجھ کو بستی کی طرف لائی ہے پانی کی تلاش
گم نہ ہو جاؤں کہیں مجھ کو صدا دے جنگل

دانے ہوتے ہیں جہاں جال بھی ہوتے ہیں وہیں
اپنے معصوم پرندوں کو دُعا دے جنگل

آگ دنیا نے لگائی ہے ترے سینے میں
تو بھی اس آگ سے دنیا کو جلا دے جنگل

شہر صدیوں سے تجھے کاٹ رہا ہے ہر دن
شہر کو تو بھی کسی روز مٹا دے جنگل

مجھ سے مت پوچھ کہ میں راکھ ہوا ہوں کیسے
تو بھی جل جائے گا مت مجھ کو ہوا دے جنگل

آسماں تیر لئے روز مجھے ڈھونڈتا ہے
مجھ کو چھتنار درختوں میں چھپا دے جنگل

خواب یہ ہے کہ شکاری ہیں مجھے گھیرے ہوئے
اور میں نیند میں ہوں مجھ کو جگا دے جنگل

خون میں ڈوبے ہوئے ہیں سبھی مندر مسجد
مجھ کو پوجا کے لیے اپنا خدا دے جنگل

بھاگتے بھاگتے میں تھک سا گیا ہوں یارا
میرے رستے میں کوئی پیڑ گرا دے جنگل

اب جو جنموں تو میں انسان نہیں پیڑ بنوں
مر گیا ہوں مجھے مٹی میں ملا دے جنگل

دیواروں پر گھاس اُگی ہے کمرا کمرا جنگل ہے
جنگل تو باہر ہوتا ہے اندر کیسا جنگل ہے

کوئی بتائے کہاں بساؤں انسانوں کی بستی میں
کہاں سے کاٹوں کتنا کاٹوں پوری دنیا جنگل ہے

یہاں وہاں سے کٹ جاتا ہوں میں بھی جنگل کٹنے سے
میں جنگل میں رہتا ہوں یا مجھ میں رہتا جنگل ہے

پنچھی اپنے آپ میں گم ہیں، ہوا بھی چپ سنّاٹا بھی
بھرا پُرا جنگل ہے لیکن کتنا تنہا جنگل ہے

کہیں پرندے، کہیں جانور، کہیں پہ تتلی، کہیں پہ پھول
بچوں کے سامان کے جیسا بکھرا بکھرا جنگل ہے

وہی ہے رنگت، وہی ہے سایہ، وہی ہے پت جھڑ، وہی بہار
دنیا جھوٹی ہوگئی لیکن آج بھی سچا جنگل ہے

میں نے پکچر میں دیکھا تھا آدم بابا رہتے تھے
تب سے اب تک سوچ رہا ہوں کتنا بوڑھا جنگل ہے

بستی پیچھے آگے جنگل
اور کہاں تک بھاگے جنگل

دریا کی سازش پہ چپ ہے
کتنا بے بس لاگے جنگل

جانے کیسا ڈر ہے من میں
پورے تن سے جاگے جنگل

ہاتھ اٹھا کر آسمان سے
خیر سبھی کی مانگے جنگل

کتھا سناؤں کیا رشتوں کی
ٹوٹ گئے سب دھاگے جنگل

❀

شہر بہت پاگل ہے لیکن دیوانہ ہے جنگل بھی
کہہ کر دیکھو سن کر دیکھو افسانہ ہے جنگل بھی

بوتل میں جو نشہ ہے اس کو ہوا میں بھی محسوس کرو
شام ڈھلے تو گھوم کے دیکھو میخانہ ہے جنگل بھی

صحرا اور سمندر میرے ہاتھوں پیروں سے واقف
چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے جنگل بھی

دل اُجڑے تو ساری دنیا اُجڑی اُجڑی لگتی ہے
گھر بھی ہے اجنبیوں جیسا بیگانہ ہے جنگل بھی

مذہب کی بیماری ایسی پھیلائی انسانوں نے
تھوڑا سا مسجد ہے تھوڑا بت خانہ ہے جنگل بھی

دھوپ کا، چھاؤں کا، بارش کا، ہوا کا جنگل
رام ہیں اس میں جلاؤ نہ خدا کا جنگل

جانے کب چیخ پڑوں برسوں سے خاموش ہوں میں
اُگ رہا ہے مرے سینے میں صدا کا جنگل

ایک درگاہ ہرے رنگ کی ویران ہوئی
کچھ گنہگاروں نے پھونکا ہے دُعا کا جنگل

مانگتے پھرتے ہیں اب نیم حکیموں سے علاج
خود ہی کاٹا ہے مریضوں نے دوا کا جنگل

چھپ کے رہتے ہیں کئی بھوکے درندے مجھ میں
اس طرف آنا نہیں میں ہوں سزا کا جنگل

ایک دن پیڑ سبھی جڑ سے اُکھڑ جائیں گے
بات مانو مری دنیا ہے فنا کا جنگل

ہم یاروں کا یار ہے جنگل
ہفتے میں اتوار ہے جنگل

دریا کے اِس پار ہے صحرا
دریا کے اُس پار ہے جنگل

دھرم نہ پوچھے ذات نہ پوچھے
سب کا پالنہار ہے جنگل

تم بھی کچھ دن رہ کر دیکھو
ایک الگ سنسار ہے جنگل

کیسے کیسے پھول کھلے ہیں
کتنا خوشبودار ہے جنگل

پربت کو باندھے رکھتا ہے
رسّی ہے نہ تار ہے جنگل

دنیا ہے پانی ہی پانی
کشتی ہے پتوار ہے جنگل

بستیاں بس گئیں، اشجار سے جنگل نکلا
کٹ گئے پیڑ تو دیوار سے جنگل نکلا

ایک دن بہتے ہوئے دریا کو روکا ہم نے
میں ادھر سے چلا اُس پار سے جنگل نکلا

اک چبھن بن کے رہا میرا سفر بھی مجھ میں
پاؤں سے نکلے ہوئے خار سے جنگل نکلا

پہلے کاٹا گیا پھر کاٹ کے جوڑا بھی گیا
پھر نئی شکل میں بازار سے جنگل نکلا

اس میں دَر آئے تھے امراض درندوں کی طرح
رُک گئی سانس تو بیمار سے جنگل نکلا

جرم چھپتا ہے کہاں رات کے پردے میں شکیلؔ
ہو گئی صبح تو اخبار سے جنگل نکلا

❁

صدیوں سے چپ رہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں
اسی لئے تو دکھ سہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

یہاں وہاں کھلتا رہتا ہوں میں تو ہوں آوارہ پھول
ٹوٹ کے دریا میں بہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

کوئی نہیں رہتا ہے مجھ میں ساحل پر میں ریت کا گھر
آندھی آئے تو ڈھہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

کتنے بے رشتہ ہیں تینوں اپنے اپنے رشتوں میں
بھیڑ میں بھی تنہا رہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

آوازوں کے اس میلے میں اپنی بھاشا سمجھے کون
بن بولے سب کچھ کہتے ہیں سناٹا جنگل اور میں

کٹے ہیں ہاتھ پیڑوں کے دُعا جنگل سے غائب ہے
قیامت آنے والی ہے خدا جنگل سے غائب ہے

درندے آدمی کا روپ دھارن کرتے جاتے ہیں
مرض بڑھنے لگا ہے اور دوا جنگل سے غائب ہے

کسے معلوم چنگاری کہاں سے اُڑ کے آئی تھی
لگا کر آگ جنگل میں ہوا جنگل سے غائب ہے

زمینیں تپ رہی ہیں مر رہے ہیں جانور سارے
نہ پانی ہے نہ سایہ ہے گھٹا جنگل سے غائب ہے

پرندے، جانور، کیڑے، سبھی آپس میں لڑتے ہیں
کئی دن سے محبت کی فضا جنگل سے غائب ہے

ہزاروں لاشیں بکھری ہیں، جو زندہ ہیں وہ زخمی ہیں
نہ لکڑی ہے نہ اگنی ہے چتا جنگل سے غائب ہے

❁

ساون بھادوں، بادل بجلی، برکھا پانی پیڑ
چھتری اوڑھے کھڑے ہوئے ہیں دھانی دھانی پیڑ

جنگل ہے محل، برگد پیپل سارے چوکیدار
آم اور املی بنے ہوئے ہیں راجا رانی پیڑ

پودے سارے بھیا بابو، دیدی بہنی، دوست
اماں ابا، دادا دادی، نانا نانی پیڑ

کس کارن دھرتی بانٹی تھی، پھل بدلے نہ پھول
اک جیسے ہیں ہندستانی پاکستانی پیڑ

چلتے چلتے گر جاتے ہیں رستے میں اک روز
جیتے جیتے مر جاتے ہیں ہم انسانی پیڑ

برسوں پھولی پھلی ہے لکڑی
پھر چولھے میں جلی ہے لکڑی

عاشق آگ لیے پھرتا ہے
محبوبہ کی گلی ہے لکڑی

ناچ رہی ہے دھوئیں کی لَے پر
گاتی علی علی ہے لکڑی

پہلے کاٹی گئی ہے جبراً
پھر سانچے میں ڈھلی ہے لکڑی

تیز ہوا سے ڈر جاتی ہے
دیواروں میں پلی ہے لکڑی

پتا نہیں کب گھر پہنچے گی
جنگل سے تو چلی ہے لکڑی

میل جول ہے چوپالوں کی
ہر حقّے کی نلی ہے لکڑی

دھوپ میں دن بھر جلا ہے جنگل
سورج سا پھر ڈھلا ہے جنگل

پربت پربت، صحرا صحرا
کتنا پیدل چلا ہے جنگل

دیکھ لیا سب جوڑ گھٹا کر
گنزوت نہیں ہے کلا ہے جنگل

صوفی کا سنگیت ہے اس میں
اور جوگی کا گلا ہے جنگل

سر پر میں الزام ہزاروں
پھر بھی کتنا بھلا ہے جنگل

مری خاموش وحشت کا نشاں جنگل سے نکلا تھا
لگی تھی آگ سینے میں دھواں جنگل سے نکلا تھا

ہوائیں لے اُڑی تھیں ایک دن میرے سبھی آنسو
پھر اس کے بعد اک آبِ رواں جنگل سے نکلا تھا

خیال آیا جب اُڑنے کا تو پَر نکلے پرندوں کے
پَروں کے ساتھ ہی اک آسماں جنگل سے نکلا تھا

بُرائی نے بہت روکا تھا ہم کو آگے بڑھنے سے
بھلائی کی طرف جب کارواں جنگل سے نکلا تھا

شجر بھی کٹتے رہتے ہیں فنا بستی بھی ہوتی ہے
کھدائی ہو رہی تھی جب مکاں جنگل سے نکلا تھا

کٹی تھی عمر میری راستہ ہموار کرنے میں
ملا تھا پھر سے جنگل میں جہاں جنگل سے نکلا تھا

ہزاروں سال تک سنانے کو سنتا رہا چپ چاپ
میں اس کے بعد کہنے داستاں جنگل سے نکلا تھا

تن من میں اک آلس ہے اور انگڑائی ہے جنگل میں
ہلکے ہلکے نشے کے جیسی پُروائی ہے جنگل میں

پورا جنگل مہک رہا ہے آم کے بور کی خوشبو سے
اور ہوا بھی بور سے مل کے بورائی ہے جنگل میں

میں نے جتنے جسم چھوئے تھے سب ہاتھوں میں بھر آئے
یادوں کا میلہ ہے مجھ میں تنہائی ہے جنگل میں

جنگل میں ہیں چند شکاری شہر میں غنڈے ہوں جیسے
اک لڑکی ہرنی کے جیسی گھبرائی ہے جنگل میں

ایک دُکان ہے جس میں کچھ سامان رکھے ہیں جینے کے
لیکن کون خریدے ان کو مہنگائی ہے جنگل میں

پیلا ذرا ذرا ہے جنگل
پھر بھی کتنا ہرا ہے جنگل

نئے نئے پتّے آئے ہیں
اُمیدوں سے بھرا ہے جنگل

جانے کس نے کہاں سے لاکے
ہر پربت پہ دھرا ہے جنگل

سوتے سوتے چیخ اُٹھا ہے
خواب میں شاید ڈرا ہے جنگل

کٹا پھٹا ہے یہاں وہاں سے
تڑپ تڑپ کے مرا ہے جنگل

پت جھڑ کو پھر بھوک لگی تھی
پت جھڑ نے پھر چرا ہے جنگل

بات بہت ہی کم کرتا ہے
بات کا لیکن کھرا ہے جنگل

کانٹے خود اپنی راہ میں بوتا ہے جنگلی
اکثر پڑھے لکھوں میں بھی ہوتا ہے جنگلی

دن بھر شکار کرتا ہے جنگل میں گھوم کے
راتوں کو چڑھ کے پیڑ پہ سوتا ہے جنگلی

اک پاپ ہے جو آج بھی پرکھوں کے سر پہ ہے
اک بوجھ ہے جو صدیوں سے ڈھوتا ہے جنگلی

جنگل میں ایک لاش کے نزدیک بیٹھ کر
میلی کچیلی آنکھ سے روتا ہے جنگلی

جب سے ہوئی ہے شہر کی لڑکی سے دوستی
کھانے سے پہلے ہاتھ بھی دھوتا ہے جنگلی

❁

پیڑوں کا سمان ہو بھائی
جنگل کا گن گان ہو بھائی

جنگل نے صحرا سے پوچھا
کیوں اتنے ویران ہو بھائی

لکڑی نے دیمک سے پوچھا
کیا تم بھی انسان ہو بھائی

وادی نے پربت سے پوچھا
کیوں بنتے بھگوان ہو بھائی

پیڑوں نے دریا سے پوچھا
لاتے کیوں طوفان ہو بھائی

کوّے نے طوطے سے پوچھا
کیوں اتنے نادان ہو بھائی

کوئل نے کوّے سے پوچھا
کیوں اتنے شیطان ہو بھائی

تتلی نے اک پھول سے پوچھا
کیوں مجھ سے انجان ہو بھائی

سیتا لچھمن رام ہے جنگل
جیسے کوئی دھام ہے جنگل

شبری کے جوٹھے بیروں سے
میٹھا صبح و شام ہے جنگل

پتّے پتّے پر لکھا ہے
میرا کا گھنشیام ہے جنگل

جانا تیری چھاؤں میں رہ کے
ماں جیسا آرام ہے **جنگل**

آ میرے سائے میں آجا
سر پر تیرے گھام ہے جنگل

پرکھوں نے کچھ پاپ کئے تھے
صدیوں سے بدنام ہے جنگل

پاگل، وحشی، ان پڑھ، جاہل
تجھ پہ سو الزام ہے جنگل

رم جھم رم جھم برساتوں میں
چھلکا چھلکا جام ہے جنگل

الہڑ سی اک بھور کنواری
دلہن جیسی شام ہے جنگل

موسم بدلے، ہوا چلائے
یہ بھی کوئی کام ہے جنگل

جہاں تک ترا آسماں ہے پرندے
وہاں تک دھواں ہی دھواں ہے پرندے

جلا تیرا جنگل، لُٹی تیری بستی
تجھے کچھ خبر ہے کہاں ہے پرندے

دبایا گیا ہے اُڑانوں کو تیری
ترے سر پہ کوہِ گراں ہے پرندے

جو کہنا ہے تجھ کو وہ آنکھوں سے رولے
کہاں تیرے منھ میں زباں ہے پرندے

ترے گھونسلے میں ہے سانپوں کا ڈیرہ
کہاں اب ترا آشیاں ہے پرندے

نہیں کوئی باقی قبیلے میں تیرے
وہیں تو بھی مر جا جہاں ہے پرندے

اکیلا تو رہ لے گا اور وہ بھی زندہ
یہ سب تیرا وہم و گماں ہے پرندے

نہیں جو کسی سے ڈرے گا پرندے
تو بے موت اک دن مرے گا پرندے

محبت نے لاکھوں ہزاروں کو مارا
محبت میں تو بھی مرے گا پرندے

یہاں پارسا ہیں گنہگار سارے
تو الزام کس پر دھرے گا پرندے

ٹھہر جا ٹھہر جا کہیں تو ٹھہر جا
کہاں تک اڑانیں بھرے گا پرندے

بہت اڑ رہا تھا پھنسا جال میں نا
مری جان اب کیا کرے گا پرندے

دھرتی ماں کی جان ہے جنگل
قدرت کی پہچان ہے جنگل

غور سے دیکھو خدا دِکھے گا
مانو تو بھگوان ہے جنگل

تُلسی داس کی رامائن ہے
غالب کا دیوان ہے جنگل

مر کے راکھ یہیں ہونا ہے
اَرتھی ہے شمشان ہے جنگل

مذہب ہے جنگل کے باہر
مذہب سے انجان ہے جنگل

اک آواز ہے ہر پتّے میں
پھر بھی کیوں سنسان ہے جنگل

پانی ہے آئینے جیسا
پانی میں حیران ہے جنگل

ابھی ابھی آندھی گزری ہے
آج بہت ویران ہے جنگل

پھٹا پرانا کپڑا پہنے
گاؤں کا اک انسان ہے جنگل

پیڑ ہیں سارے فوجی جیسے
پورا ہندستان ہے جنگل

پہلے گل بوٹے اُگتے تھے
اب چٹیل میدان ہے جنگل

بیٹھ کے گملے میں آیا ہے
آج مرا مہمان ہے جنگل

صوفی سنت، فقیر، شکیلؔ
سب کا دھیان ہے گیان ہے جنگل

اُڑتی پھرتی ہوئی تتلیاں جنگلی
مجھ کو اچھی لگیں لڑکیاں جنگلی

میری بستی میں جنگل بھی آباد ہے
مجھ میں رہتی ہیں کچھ بلّیاں جنگلی

آج کل میرے جنگل میں سیلاب ہے
ہو گئی ہیں سبھی مچھلیاں جنگلی

کچھ دنوں کے لیے ہم جو باہر گئے
گھر میں اُگنے لگیں جھاڑیاں جنگلی

تم نے سویٹر بُنا تھا مرے نام کا
میں بھی لایا تھا کچھ سردیاں جنگلی

رات بھی ہے سنیچر کی اور تم بھی ہو
آج کرتے ہیں کچھ مستیاں جنگلی

اک پرندے کو پنجرے میں دیکھا شکیلؔ
اور کھلنے لگیں کھڑکیاں جنگلی

چھپ کے کوئی گل کرتے ہیں چل جنگل
جنگل وِچ منگل کرتے ہیں چل جنگل

پیار میں جب ہم دونوں ہی جھوٹے ہیں تو
کوئی سچا چھل کرتے ہیں چل جنگل

بہت بڑی بڑی آنکھیں ہیں جان تری
ان میں کچھ کاجل کرتے ہیں چل جنگل

پانی بہت چھپا ہوا ہے جنگل میں
پانی کو بادل کرتے ہیں چل جنگل

تیرا میرا آج فیصلہ ہو جائے
اک ایسا دنگل کرتے ہیں چل جنگل

لیلیٰ ہے چھبیلا ہے جنگل میں منگل ہے
موسم بھی بدلا ہے جنگل میں منگل ہے

بارش ہی بارش ہے پانی ہی پانی ہے
ہر کوئی پھسلا ہے جنگل میں منگل ہے

راجہ کی بانہوں میں رانی کی چالیں ہیں
دلبے پہ نہلا ہے جنگل میں منگل ہے

معشوقہ بھڑکی ہے بجلی سی کڑکی ہے
عاشق بھی پگلا ہے جنگل میں منگل ہے

پھوکٹ کی پکنک ہے انگریزی میوزک ہے
یاروں کا بنگلہ ہے جنگل میں منگل ہے

چلمیں[1] سوالی ہے بوتل بھی خالی ہے
ہر کوئی کنگلا ہے جنگل میں منگل ہے

گھاسوں کا بستر ہے تاروں کی چادر ہے
کھڑکی نہ جنگلہ ہے جنگل میں منگل ہے

---

[1] اہل زبان سے معذرت کے ساتھ۔

کالے ہوں یا پیلے سانپ
سارے ہیں زہریلے سانپ

پی کے اپنے غصے کو
ہو جاتے ہیں نیلے سانپ

پانی برسا جنگل میں
گھوم رہے ہیں گیلے سانپ

جس دن کینچل چھوڑی تھی
کتنے تھے چمکیلے سانپ

خوابوں میں جب آتے ہیں
لگتے ہیں رنگیلے سانپ

منھ سے جھاگ نکال رہا ہے ہانپ رہا ہے جانور
اپنے ہی غصے میں تھر تھر کانپ رہا ہے جانور

کہیں کوئی بندوق کی نالی تنی ہوئی ہے سامنے
چھپ کے رستہ سونگھ رہا ہے بھانپ رہا ہے جانور

چند شکاری گھیرا ڈالے ڈھونڈ رہے ہیں دیر سے
اک جھاڑی کے اندر خود کو ڈھانپ رہا ہے جانور

اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہیں آدمی
جال پھاڑ کے ٹوٹ پڑا ہے چانپ رہا ہے جانور

شاید کچھ آرام ملا زخموں کو اپنے چاٹ کے
نیند لگی ہے بیٹھے بیٹھے جھانپ رہا ہے جانور

شیروں کے ساتھ اُترا دنگل میں بھیڑیا
مارا گیا نا آخر جنگل میں بھیڑیا

آیا ہے پی کے پھر سے انسان کا لہو
پھر چھپ رہا ہے ماں کے آنچل میں بھیڑیا

اکڑا ہوا پڑا ہے سردی میں آدمی
منھ ڈھانپے سو رہا ہے کمبل میں بھیڑیا

چکّر میں بکریوں کے اک روز یوں ہوا
خود مر گیا تھا پھنس کے دلدل میں بھیڑیا

آساں نہیں ہے اس کی آنکھوں میں جھانکنا
بیٹھا ہوا ہو جیسے کاجل میں بھیڑیا

زخموں میں لکڑیوں کے کھویا تھا لکڑہارا
تم مانو یا نہ مانو رویا تھا لکڑہارا

دن بھر بہت چلائیں آرا مشینیں اُس نے
تب کھا کے روکھی سوکھی سویا تھا لکڑہارا

تھے پیڑ ٹکڑے ٹکڑے انساں کے جسم جیسے
کاندھے پہ ارتھیوں کو ڈھویا تھا لکڑہارا

دھبہ لگا تھا جیسا قاتل کی آستیں پر
ویسا ہی داغ اک دن دھویا تھا لکڑہارا

پیشہ بدل بھی جائے عادت نہیں بدلتی
کھیتوں میں اپنے جنگل بویا تھا لکڑہارا

❁

تجھ میں کیسا سناٹا ہے، رات گئے کیوں بولے جنگل
ساری دنیا سوئی ہوئی ہے تو بھی تھوڑا سولے جنگل

بھول جا تجھ پہ کس نے کس نے کچرا پھینکا دھول اڑائی
بادل پانی لے آیا ہے اپنے کپڑے دھولے جنگل

تیرے بھی کچھ پیڑ گرے ہیں مجھ سے بھی کوئی بچھڑا ہے
میں بھی ہوں تیرے ہی جیسا مجھ سے مل کے رولے جنگل

میں دریا ہوں پیاس بجھاؤں تو جنگل ہے سایہ کر
میں صحرا کی اور مڑوں تو ساتھ میں تو بھی ہولے جنگل

دنیا بہت بڑی ہے لیکن اچھے بھی کچھ لوگ ہیں اس میں
ان اچھے لوگوں کی خاطر پاپ کی گٹھری ڈھولے جنگل

خون کا قرض ہے، چُک جائے گا ایمان کے ساتھ
میں ابھی بَن میں ہوں، بنواس کے وردان کے ساتھ

میری اوقات ہی کیا پھول ہوں جنگل کا مگر
کوئی رشتہ ہے مرا شہر کے گلدان کے ساتھ

میں نے جنگل میں نبھائے ہیں بڑی خوبی سے
فرض جتنے بھی ہیں انسان کے ساتھ

کم نہیں ہوتا کوئی چودہ برس کا رشتہ
مجھ میں زندہ مرا جنگل ہے مری جان کے ساتھ

اتنے دن بعد نہ ڈھونڈو مرا چہرہ مجھ میں
میں وہی رام ہوں لیکن نئی پہچان کے ساتھ

بنواس: معاصرین کی نظر میں

شکیل اعظمی ہمعصر شعری منظر نامے کا ایک معتبر نام ہے۔ اپنی شعری کائنات سے متعلق اپنے اسلوب کے سبب انھوں نے شہرت حاصل کی۔ عہد حاضر میں ایسے تخلیق کار نہیں ہیں جو Creative Epic (تخلیقی رزمیہ) پر قلم اٹھائیں۔ لیکن شکیل اعظمی نے یہ کام کر کے اردو شاعری میں اپنا الگ مقام بنایا ہے۔

مضمون: 'شکیل اعظمی: ہمعصر شعری منظر نامے کا ایک معتبر نام' سے اقتباس — عنبر بہرائچی

شکیل اعظمی ہمارے زمانے کے ممتاز شاعر ہیں۔ ادبی طور پر وہ خواص میں جس قدر مقبول ہیں اسی قدر اپنے فلمی گیتوں اور مشاعروں کی وجہ سے عوام میں بھی مشہور ہیں۔ فلمی دنیا اور مشاعروں کی مخصوص فضا میں رہنے کے باوجود شکیل اعظمی نے اپنے ادبی کیریر سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہر تازہ مجموعہ کلام میں نیاپن اور مسلسل ارتقا نظر آتا ہے۔ اور اب ان کا یہ مجموعہ کلام 'بنواس' شاعر کے کمال فن اور تخلیقی جوہر کا بہترین نمونہ بن کر ہمارے سامنے ہے۔ شکیل اعظمی اب شعر گوئی کی اس منزل پر ہیں جس کو سمجھنے کے لیے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے گرفت میں نہیں آتی۔ شکیل اعظمی اپنی شاعری کے رموز سے خوب واقف ہیں اور انھیں اس بات کا بھی علم ہے کہ انھوں نے 'بنواس' کے اس گلدستے کو نئی طرح کے پھولوں سے تیار کیا ہے۔

مضمون: 'امیدوں سے بھرا ہے جنگل' سے اقتباس — پروفیسر مہتاب حیدر نقوی

'بنواس' انسان اور فطرت کے درمیان پوشیدہ ایک جہان حیرت کا روشن استعارہ اور دونوں کے درمیان چھپے ہوئے خزانے کی کلید ہے۔ شکیل اعظمی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اندر اور باہر کے جنگل کا ایک دوسرے سے وصال کرا دیا ہے۔ میں شکیل اعظمی کو سلام کرتا ہوں اور اس جہان حیرت کے سفر کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مضمون: 'بنواس کا شکیل اعظمی' سے اقتباس — عین تابش

شکیل اعظمی کا یہ خوبصورت شعری مجموعہ 'بنواس' مجھے امریکن ایب سٹریکٹ (Abstract) پینٹر جیکسن پولاک (1912-1956) کی پینٹنگ کی طرح نظر آتا ہے۔ اور میں اس کے رنگوں کے فواروں میں نہاتا ہوں۔

8/ اگست 2020ء (احمد آباد) جینت پرمار

شکیل اعظمی کا تازہ ترین مجموعہ 'بنواس' اردو کی نظمیہ شاعری میں ایک غیر معمولی اضافہ ہے۔ ہماری شعری روایت میں منظری شاعری کا ایک الگ مقام و مرتبہ ہے۔ اس مخصوص حوالے سے نظیر اکبر آبادی، علامہ محمد اقبال، جوش اور محمد علوی کے ساتھ شکیل اعظمی کا نام بھی نمایاں طور پر سامنے آیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اردو کو اب جا کے اس کا اپنا ایک سچا شاعرِ فطرت ورڈس ورتھ (Words Worth) نصیب ہوا ہے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں نظموں کا یہ ہرا بھرا جنگل نامہ 'بنواس' اردو کے فطری اور امکاناتی تخلیقی اجتہاد کی سمت ایک نئی پیش بندی یا جست بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس کا سارا کریڈٹ شکیل اعظمی کو ملنا ہی چاہیے کہ آنے والی نسلیں انھیں اس تخلیقی شادابی کے عنوان سے کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ رامائن کے تعلق سے کثیر جہاتی و ہمہ صفاتی نظمیں بھی کمال کی ہیں۔ گویا کہ 'بنواس' دنیائے ادب کا مختصر ترین رزمیہ (Epic) بھی کہلانے کا مستحق ہے۔ اور اس پر فطرت کی بوقلمونی کی تخلیقی ترجمانی والی دیگر نظمیں تو مستزاد ہیں ہی۔ اس انتہائی حیرت انگیز کارنامہ پر میں شکیل اعظمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خورشید اکبر

7/ اگست 2020ء (پٹنہ)

مجھے 'بنواس' کے تعلق سے صرف اتنا لکھنا چاہیے کہ ایک مہاکاویہ کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا کام بڑی ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔ ایک موضوع کو اتنے سارے تاریخی (دیومالائی) کرداروں کے وسیلے سے پُر اثر انداز میں بیان کر جانا نئی نسل کے شاعر شکیل اعظمی کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ 'بنواس' جدید تر اردو شاعری کا ایک شاہکار ہے جس کا پُر زور استقبال کیا جانا چاہیے۔

مضمون: 'زندگی کے بنواس کا شاعر: شکیل اعظمی' سے اقتباس ڈاکٹر جمال اویسی

جب جنگل میں لہلہاتے ہوئے پیڑ پودے، چرند پرند، پہاڑ اور جھرنے ہم آواز ہوں تو انھیں سننے اور ان کی زبان سمجھنے کے لیے سماعتوں اور بصیرتوں کو کٹھن تپسیا سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر ایک سادھنا اسے شاعری میں ڈھالنے کے لیے بھی لازمی ٹھہری جس میں کامیابی تبھی ممکن ہو پاتی ہے جب ناظر ناظر نہ رہ کر خود منظر میں تحلیل ہو جائے۔ اساطیری اور دیومالائی کرداروواقعات کے حوالے سے فطرت اور انسان کے تعلق کو نظموں کا پیرہن عطا کرنا یقیناً مشکل کام رہا ہوگا لیکن شکیل اعظمی اس مشکل کام کو آسان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ شہر میں شب گردی اور جنگلوں میں چہل قدمی کرنے والے شاعر شکیل اعظمی کا یہ مجموعہ 'بنواس' اساطیر اور جنگل کی یکجائی کا جشن ہے۔

9/اگست 2020ء (گریٹر نوئیڈا)

نعمان شوق

اگر دیکھا جائے تو یہ پوری کتاب Eco-Poetry کا خوبصورت مرقع ہے یا یوں کہہ لیں کہ جنگل ایک کینوس ہے جس پر شکیل اعظمی نے چھوٹی چھوٹی نقاشی اور مصوری یعنی Miniature Painting کے ذریعہ ایک ایسا متحرک کولاژ خلق کیا ہے جس پر دور ہی سے قدرت کے مناظر متحرک نظر آتے ہیں۔

مضمون: شکیل اعظمی کا شعری بنواس سے اقتباس

پروفیسر کوثر مظہری

اردو کی پوری ادبی تاریخ میں ہماری نگاہ میں کوئی ایسا مجموعہ نظر نہیں آتا جسے جنگل کے دائرے میں رہ کر پیش کیا گیا ہو۔ ہمیں واقعی کسی نئے منظرنامے کی تلاش تھی جسے شکیل اعظمی کے اس مجموعے نے ایک منزل تک پہنچا دیا۔

مضمون: بنواس: شکیل اعظمی کا نیا منظرنامہ سے اقتباس

پروفیسر صفدر امام قادری

'بنواس' کے مطالعے کے بعد قاری کے ذہن میں اٹھنے والے مذکورہ بالا سوالات شکیل اعظمی کو اردو کے موجودہ عہد کے شعری منظرنامے پر بہت اونچے مقام پر لے جاتے ہیں اور ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ شکیل ہمارے عہد کے بہت اہم اور بلیغ فن کار ہیں۔ شکیل اعظمی کے شعری مجموعے 'بنواس' کی قرأت ہمیں شکیل کو بڑے شعرا کی صف میں رکھ کر دیکھنے، پرکھنے اور بار بار غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

مضمون: 'فطرت کا بنواس: شکیل اعظمی کا ماحولیاتی رزمیہ' سے اقتباس

پروفیسر مولا بخش

شکیل اعظمی کا تازہ ترین مجموعہ 'بنواس' رام کے بن باس اور منسلکہ کرداروں کا بیانیہ اور جنگل کے مختلف النوع مظاہر کا شاعرانہ اور پرجوش اظہار ہے اور یہ جشنِ جنگل اور اس کے مختلف سوانگوں، حالات و محسوسات، صبحوں، شاموں، دوپہروں، خاموشیوں، ہنگامہ خیزیوں، المناکیوں اور طربناکیوں کے اظہار پر محیط ہے جس میں شکیل اعظمی نے اپنے ندرتِ کلام سے جنگل کو ایک جسم اور روح اور دماغ عطا کرتے ہوئے ایک زندہ، متحرک اور حساس انسانی یا حیاتیاتی وجود فراہم کیا ہے۔ جو شوریدہ سر تخلیقیت، شاعرانہ زرخیزی اور غنائیت کا ثبوت ہے۔

28/اگست 2020ء (ممبئی) اکرام خاور

شکیل اعظمی کا نام موجودہ عہد کے نئے شعری منظر نامے کا معتبر حوالہ ہے۔ 'بنواس' اور اس میں شامل نظموں کا ذائقہ بالکل انوکھا اور منفرد ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ کارنامہ نہ صرف ناقدینِ شعر و ادب سے خراج وصول کرے گا بلکہ ایوانِ ادب میں ارتعاش بھی پیدا کرے گا۔

مضمون: 'بنواس کی شاعری اور قدیم ہندوستانی تہذیب و ثقافت' سے اقتباس سلیم انصاری

شکیل اعظمی نے غزل کے حوالے سے اپنی پہچان بنائی ہے۔ 'پوکھر میں سنگھاڑے' اور اب 'بنواس' کے ذریعہ نظم نگاری میں ان کے تیور بولتے نظر آتے ہیں۔ 'جنگل' ان نظموں میں ایسے ایسے رنگوں میں نظر آتا ہے کہ قاری متحیر ہو جائے۔ نظموں کے اس قحط زدہ دور میں ایک خاص پس منظر میں کہی گئی ان نظموں کو نعمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ شکیل اعظمی اپنے ہمعصروں میں بڑی سرعت کے ساتھ اپنی شناخت و نہج کے استحکام کی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ 'بنواس' کی نظمیں ان کے اس سفر میں میل کا پتھر ثابت ہوں گی۔

یکم ستمبر 2020ء (گلبرگہ) اکرم نقاش

ایک مخصوص موضوع کے التزام کے ساتھ شکیل اعظمی نے 'بنواس' میں اساطیری حسیت، قدیم و جدید تہذیبی منظر نامہ اور زمانہ حال کے سماجی و سیاسی تناظر کو جس طرح ایک کینوس پر متشکل کیا ہے اور اس سے جو تصویر بنائی ہے اس کی رنگینی اور دلکشی بلاشبہ دیدنی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ مجموعہ

جدید شعری روایت میں دیر تک اپنی الگ پہچان قائم رکھے گا۔

مضمون: 'بنواس: شکیل اعظمی کا ایک نیا سنگِ میل' سے اقتباس — **پروفیسر احمد محفوظ**

شکیل اعظمی نے جنگل اور اس کے بیش تر وجودی پہلوؤں کو جس طرح اپنی فکر میں پرویا ہے اُس سے ایک اعلیٰ شاعرانہ عمل ہم سے ہم کنار ہوتا ہے۔ شکیل نے جنگل، اس کی خوشیاں، اس کے غم، اس کی دانائی اور اس کے رشتوں کو جس تخلیقی جال میں باندھا ہے اُس کی بساط ایک اعلیٰ کارنامے کی ہے۔ درحقیقت 'بنواس' کو ایک گہری تنقیدی نظر درکار ہے۔ شکیل کے 'بنواس' سے اگر ہم اپنے باطنی وجودی جنگلوں کے آثار فراہم نہ کر سکے تو ہمارے ادبی فہم کی نااہلی کے سوا کسی اور پر اُنگلی نہیں اٹھائی جا سکے گی۔

مضمون: شکیل اعظمی کے جنگل پر ایک نظر سے اقتباس — **ریاض لطیف**

'بنواس' شکیل اعظمی کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ جنگل اور متعلقاتِ جنگل سے متعلق نباتات و حیوانات کو بنیادی استعارہ بنا کر تخلیق کی گئی نظموں سے آراستہ یہ مجموعہ فطرت اور ماحولیات سے متعلق اردو شاعری میں اپنی الگ شناخت قائم کرتا ہے۔

6؍جون 2020ء شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) — **پروفیسر سراج اجملی**

شکیل اعظمی اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے فلم اور مشاعروں میں بھی اپنا الگ مقام بنایا ہے۔ ادبی رسالوں میں وہ ایک زمانے سے چھپتے آرہے ہیں۔ 'بنواس' ان کا ساتواں شعری مجموعہ ہے لیکن اردو ادب کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے جس میں رامائن کے ہر کردار کو شعری پیکر عطا کیا گیا ہے اور جنگل کی معصومیت، پُر اسراریت اور تمام تر مناظرِ فطرت کی بے حد دلکش تصویر بنائی گئی ہے۔ موضوع کی رعایت سے 'بنواس' کا ڈکشن بھی منفرد ہے جو ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتا ہے۔ ہمارے ادب میں اس قیمتی اضافے کے لیے میں شکیل اعظمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عتیق انظر

۲؍ستمبر 2020ء (دوحہ قطر)

کیا شاعری زمین سے اُگائی جا سکتی ہے، چٹانوں پر چھینی ہتھوڑی سے تراشی جا سکتی ہے. جنگل، ندی، آبشار، بادل اور چہچہاتے ہوئے پرندوں کی بولیوں اور شہد اور شبنم کی بوندوں سے کشید کی جا سکتی ہے؟ یہ سوال میں اپنے آپ سے اکثر کرتا رہا ہوں۔ مجھے اپنی یہ سوچ دیوانے کے خواب کی طرح لگتی تھی مگر آج جب عصرِ حاضر کے معروف شاعر شکیل اعظمی کی تازہ ترین شعری تصنیف 'بنواس' سامنے آئی تو پتہ چلا کہ خواب سچ ہو گیا۔ جنگل اور جنگل سے جڑے ہوئے ہمہ پہلو امکانات شکیل اعظمی کی تحریر میں تصویر ہو گئے ہیں۔ جنگل کو دنیا اور انسانی سماج کا استعارہ بنا کر شکیل اعظمی نے تخلیقی ادب کو ایک نئی فکری جہت اور ایک انوکھے ڈکشن سے روشناس کرایا ہے۔

28/اگست 2020ء (حیدرآباد) سردار سلیم

جنگل ایک پُراسرار تصور ہے۔ اس کی گتھیوں کو کھولنا عام اذہان کے بس کی بات نہیں۔ جنگل کی گہرائی میں اترنے کا جوکھم مول لینا حوصلے کی بات ہے۔ شکیل اعظمی نے یہ جوکھم اٹھا کر ہمیں اس تخلیقی سرشاری سے ہمکنار کیا ہے جو دھیان کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ 'بنواس' اردو شاعری میں پہلی کتاب ہے جو ابتدا تا انتہا جنگل سے تخلیقی مکالمہ کرتی ہے۔

مضمون: شکیل اعظمی کے بنواس کی شاعری سے اقتباس ڈاکٹر معید رشیدی

❁ ❁ ❁

شکیل اعظمی اگر 'بنواس' میں اپنے لوگوں سے بچھڑ جانے اور اپنی مٹی سے اُکھڑ جانے کے درد سے واقف ہیں تو وہیں 'بنواس' کی سیاست کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شکیل اعظمی کے اس 'بنواس' میں قاری مریادا پرشوتم کے نظریاتی حقائق کا بہ آسانی ادراک کر سکیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ شکیل اعظمی کا یہ 'بنواس' انسانی زندگی کے جنگل میں روشنی کا ایک الاؤ ثابت ہوگا۔

23 / اگست 2020ء (ممبئی)

حسن کمال

'بنواس' انسان اور جنگل کی ایک دوسرے میں آمد و رفت کا شعری پیکر ہے جس سے شکیل اعظمی نے ایک انوکھا تخلیقی بیانیہ ترتیب دیا ہے۔ جنگل ہماری تہذیبی زندگی میں کم از کم تین لازمی شکلوں میں شامل رہا ہے۔ قدیم فطری جنگل، ہندوستانی تہذیبی روایت کا رومانی جنگل اور تیسرا اُردو شاعری کا استعاراتی جنگل۔ شکیل اعظمی نے ان تینوں کو ایک وسیع تر شعری بیانیے میں یکجا کر دیا ہے۔ 'بنواس' شکیل اعظمی کے شعری سفر کا ایک نہایت روشن اور غیر معمولی سنگِ میل ہے جس کا شایانِ شان استقبال کیا جانا چاہیے۔

20 / اگست 2020ء (گریٹر نوئیڈا)

فرحت احساس

شکیل اعظمی ہمارے عہد کے ایسے فعال اور ذہین شاعر ہیں جن کے یہاں غیر معمولی تخلیقی وفور ہے اور اس وفور کو فنی ضبط کے ساتھ اظہار بنانے کا سلیقہ بھی ہے۔ 'بنواس' کی نظموں میں در آنے والے دیومالائی کرداروں اور کیفیات نے جہاں ایک منفرد فضا قائم کی ہے وہیں غزلوں میں استعمال ہونے والے جنگل کے متعلقات و منسلکات نے جنگل میں منگل کر کے دکھا دیا ہے۔ شکیل اعظمی نے جنگل کی رنگارنگی اور اُس کی وسعتوں کو اس فنکاری کے ساتھ اپنی تخلیقی روشنائی کا حصہ بنایا ہے کہ اس میں تجربات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

24 / اگست 2020ء شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

پروفیسر شہپر رسول

شکیل اعظمی موجودہ ادبی منظرنامے میں اپنے شعری انفراد کے باعث مختلف اور نمایاں ترین نظر آنے والے مستقبل گیر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب اور مشاعرہ دونوں جگہ اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ جنگل کے اپنے بھید ہیں۔ ان بھیدوں میں اترنا، انہیں جاننا اور بسر کرنا اور انہیں شعر میں ڈھالنا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن میں بڑی ذمّے داری سے کہتا ہوں کہ یہ مشکل کام شکیل اعظمی نے بڑی آسانی سے کیا ہے جو کسی کارنامے سے کم نہیں۔

23 / جولائی 2020ء (لاہور)

عباس تابش

شکیل اعظمی اُتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے اپنے ننیہالی گاؤں 'سہریا' میں 20 ر اپریل 1971 کو پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن اعظم گڑھ کا ہی ایک موضع 'سیدھا سلطان پور' ہے۔ ان کے والد کا نام وکیل احمد خان اور والدہ کا نام ستار النساء خان ہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کی نانی نے کی۔ وہ مکتب پڑھ کر بمبئی چلے آئے اور پھر گجرات کے شہر بڑودہ چلے گئے۔ دو سال بڑودہ میں اور دو سال بھروچ میں رہنے کے

بعد وہ سورت آگئے اور یہاں دس برس گزارے۔ 1984 میں انھوں نے پہلی غزل بڑودہ میں کہی لیکن ان کی شاعری سورت میں پروان چڑھی۔ فروری 2001 میں وہ دوبارہ بمبئی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی شاعری کے اب تک چھ مجموعے دھوپ دریا (1996) ایش ٹرے (2000) راستہ بلاتا ہے (2005) خزاں کا موسم رُکا ہوا ہے (2010) مٹی میں آسمان (2012) پوکھر میں سنگھاڑے (2014) منظر عام پر آچکے ہیں۔ 'بنواس' ان کی نظموں اور غزلوں کا ساتواں انتخاب ہے جو 'جنگل' اور 'رامائن' سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ادبی حلقوں میں اپنے موضوع کی انفرادیت اور مواد کے شعری برتاؤ کے سبب جدید تر اردو شاعری میں ایک شاہکار، مہا کاویہ اور تخلیقی رزمیے کے روپ میں دیکھی جارہی ہے۔ شکیل اعظمی کو ان کی سابقہ کتابوں پر مختلف اردو اکادمیوں سے چودہ انعامات مل چکے ہیں۔ وہ گراں قدر گجرات گورو ایوارڈ اور کیفی اعظمی ایوارڈ سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔ 1980 کے بعد کے شعرا میں انھیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے فلم، ویب سیریز، ٹی وی اور کئی پرائیویٹ البم کے لیے بھی نغمے تحریر کیے ہیں۔ 'تھپڑ'، آرٹیکل 15، ملک، شادی میں ضرور آنا، ضد، 1921، تم بن 2، مدہوشی، زہر، 1920 ایول ریٹرنس، EMI، ہانٹیڈ، نظر، دھوکہ اور وہ لمحے وغیرہ ان کی خاص فلمیں ہیں۔ مشاعرے کے سلسلے میں وہ امریکہ، کناڈا، دبئی، شارجہ، ابوظہبی، بحرین، دوحہ، قطر، سعودی عربیہ، مسقط، سری لنکا اور نیپال وغیرہ کا سفر کر چکے ہیں۔ ان کی شہرت کا دائرہ ادب سے فلم تک اور فلم سے مشاعرے تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ خواص میں جتنے ممتاز ہیں عوام میں اتنے ہی مقبول ہیں۔

(ادارہ)

...nwaas (A Collection of Urdu Poetry)
...Shakeel Azmi

arshia publications arshiapublicationspvt@gmail.com

A for Arshia Publications

ISBN 93-89455-77-4
9 789389 455779

+91 9971-77-5969

www.arshiapublications.com

arshiapublicationspvt@gmail.com